قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا اٹھہترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

مئی 2021ء

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

محنت کشوں کو سلام!

تعارف: غلام احمد پرویز

بٹالہ لاہور

(بشکریہ تحریک پاکستان گولڈ میڈل 1989ء

مطبوعہ: شعبہ تحریک پاکستان محکمہ اطلاعات وثقافت حکومت پنجاب)

علامہ غلام احمد پرویز مرحوم کی تاریخ پیدائش 9 جولائی 1903ء ہے۔ تحریک پاکستان کے دوران مرکزی حکومت ہند کے ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ قیام پاکستان کے ساتھ ہی وہ مرکزی حکومت پاکستان میں منتقل ہو گئے اور 1955ء میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

شیدائی اقبالؒ ہونے کے ناطے، آپ 1930ء سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے اس تصور کو آگے بڑھاتے رہے جسے حضرت علامہ اقبالؒ نے الہٰ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اپنے صدارتی خطبہ میں پیش کیا تھا۔

1937ء کے موسم گرما میں، علامہ اقبالؒ کے ایماء پر حضرت قائداعظمؒ نے اپنے قیام شملہ کے دوران علامہ پرویز کو بلا کر فرمایا کہ یہ مولوی صاحبان تحریک پاکستان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اس کی مدافعت کے محاذ کو میں تمہارے سپرد کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ حضرت قائداعظمؒ کی ہدایت پر وہ تمام ضروری اقدامات کیے گئے جن کے نتیجہ کے طور پر ماہنامہ ''طلوع اسلام'' کے دور جدید کا اجراء، مئی 1938ء کے شمارے کے ساتھ عمل میں آیا۔ اس ماہنامہ میں پرویز صاحب نے قرآن کریم کے عطا فرمودہ ''دوقومی نظریہ'' اس مملکت کی ضرورت اور اس کے بنیادی تقاضوں پر گرانقدر مقالات لکھے۔ اس دوران کانگریس اور نیشنلسٹ علماء کی طرف سے مسلمانوں کی جداگانہ آزاد مملکت کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا رہا، اس کا آپ نے موثر دفاع کیا۔

علامہ موصوف اس وقت سرکاری ملازمت میں تھے، اس لیے مسلم لیگ کے سٹیج سے بات کرنا تو ان کے لیے دشوار تھا تاہم دہلی اور اس کے گردونواح کے ایسے تمام شہروں میں جہاں شام کو جا کر اگلے روز علی الصبح واپس آیا جا سکے،

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

مئی 2021ء

جلد 74 | شمارہ نمبر 5

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: کیا تیار لوگ موجود ہیں؟	ادارہ	4
روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں	مفہوم القرآن	6
اسوۂ حسنہ (مسلسل)	شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور	10
فرقہ بندی قرآنِ کریم کی رو سے شرک ہے	خواجہ ازہر عباس، کراچی	29
دوقومی نظریہ پاکستان کی اسلامی مملکت میں انسانی ذات کا ارتقاء	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	40
یومِ مئی	آصف جلیل	52
بچوں کا صفحہ: تم بہت بہادر ہو	ادارہ	56

چیئرمین: خورشید انور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Is Sexual Relationship a Private Matter? 59

By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam)

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

ناشر: عرفان راٹھور اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے
غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے
یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

کیا تیار لوگ موجود ہیں؟

مزدوروں کے مسئلہ کا حل نہ سرمایہ داری میں ہے نہ اشتراکیت میں۔ نہ یورپ کے پاس ہے نہ چین کے۔ اس کا علاج نہ مزدوروں اور محنت کشوں کی ہڑتالوں میں ہے نہ ان کے ساتھ مفاہمت میں۔ اس سارے فساد کی جڑ ''مزد'' (اُجرت) کا غلط نظریہ ہے' اور جب تک یہ نظریہ باقی ہے' یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ اس کا حل صرف قرآن کے معاشی نظام میں مل سکتا ہے جس کی بنیاد حیاتِ آخرت کے ایمان پر ہے۔ اس نظام میں ہر فردِ معاشرہ محنت کش یا کام کرنے والا (ورکر) ہوتا ہے اور ہر ایک کو اس کی محنت کا پورا پورا ''صلہ'' ملتا ہے لیکن یہ صلہ اُجرت کی شکل میں نہیں ہوتا۔ یہ صلہ ملتا ہے یہاں کی طبعی زندگی کے لئے سامانِ پرورش اور آخرت کی زندگی کے مدارج کے تعین کی شکل میں۔ قرآن کریم میں شروع سے آخر تک دیکھ جایئے' اس میں صلہ یا بدلہ عمل کا ملتا ہے۔ ''مذہب'' کی دنیا میں (عمل کی جمع) اعمال سے مراد چند مخصوص رسمیں ہوجاتی ہیں لیکن عمل کے سیدھے سادے معنی کام ہیں۔ اور جب کوئی کام' دین کے پروگرام کے مطابق کیا جائے تو وہ عملِ صالحہ بن جاتا ہے۔ ان اعمال (کاموں) کا بدلہ اس دنیا میں' رزقِ کریم (باعزت روٹی) کی شکل میں ملتا ہے' اور آخرت میں خوشگوار زندگی کی صورت میں۔ لہٰذا اسلامی معاشرہ میں ہر فرد' کام کرنے والا

> اس قسم کا نظام ''بات سمجھ لینے'' سے قائم نہیں ہوسکے گا۔ جس نظام کو محض قانون کے زور پر قائم ہونا ہو' اس کے لئے ''سمجھ لینا'' کافی ہوتا ہے۔ لیکن جس نظام کا سرچشمہ ''دل کی گہرائیوں'' سے پھوٹتا ہو' اسے سمجھ لینے کے بعد' ایمان کی حیثیت سے قبول کرنا اولین شرط ہوگا۔ یہ وجہ ہے کہ جو قرآن کا نظام اس جماعت (کے ہاتھوں ہی نہیں بلکہ اس جماعت) کے اندر قائم ہوتا ہے' جس کے افراد حیاتِ آخرت کو ایمان کا درجہ دے چکے ہوں۔

(ورکر) ہوتا ہے۔ وہ کام کرتا ہے اور معاشرہ اس کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچاتا ہے۔ جہاں تک طبعی زندگی کی ضروریات کا تعلق ہے، یہ قریب قریب ہر انسان کی یکساں ہوتی ہیں۔ وہ کونسا قانونِ فطرت ہے جس کی رُو سے کہا جائے گا کہ مل کے مالک کے بچے کے لئے ناشتہ میں دودھ، انڈے، مکھن، توش، پھل ضروری ہیں اور مزدور کے بچے کے لئے سوکھی، باسی روٹی کا ٹکڑا کافی۔ خدا نے تو ان دونوں بچوں کا نظامِ پرورش ایک جیسا بنایا ہے۔ یہ تفریق رزق کی غلط تقسیم کی پیدا کردہ ہے، جس کا جواز اجرت کے نظریہ کی شکل میں پیش کر دیا جاتا ہے۔

کارل مارکس کو بھی اس کا احساس ہو گیا تھا کہ صحیح معاشی نظام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ اجرت کا تصور ہے اس لئے اس نے کہا تھا کہ صحیح نظام ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام اور ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق معاوضہ کے اصول پر قائم ہو سکے گا۔ لیکن جب اس سے کہا گیا کہ آپ اس نظام کو عملاً نافذ کرنے کا طریق کیوں نہیں بتاتے یا رائج نہیں کرتے، تو اس نے کہا کہ مجھے وہ بنیاد نہیں ملتی جس پر اس نظام کی عمارت استوار ہو سکے۔ اس لئے میں سردست اسے معرضِ التوا میں رکھتا ہوں۔ شاید ''زمانے کے تقاضے'' انسان کو اُس مقام تک لے آئیں۔

یہاں پر ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کارل مارکس نے بات تو سمجھ لی تھی لیکن اسے اس کی اساس نہیں ملتی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام ''بات سمجھ لینے'' سے قائم نہیں ہو سکے گا۔ جس نظام کو محض قانون کے زور پر قائم ہونا ہو، اس کے لئے ''سمجھ لینا'' کافی ہوتا ہے۔ لیکن جس نظام کا سرچشمہ ''دل کی گہرائیوں'' سے پھوٹتا ہو، اسے سمجھ لینے کے بعد، ایمان کی حیثیت سے قبول کرنا اولین شرط ہوگا۔ یہ وجہ ہے کہ جو قرآن کا نظام اس جماعت (کے ہاتھوں ہی نہیں بلکہ اس جماعت) کے اندر قائم ہوتا ہے، جس کے افراد حیاتِ آخرت کو ایمان کا درجہ دے چکے ہوں -- ''ایمان'' کے معنی یہ ہیں کہ ان کا کوئی عمل، اقدارِ خداوندی کے خلاف نہ ہو۔ اس قسم کے افراد کو قرآنِ کریم نے مومنین اور ان پر مشتمل جماعت کو اُمتِ مسلمہ کہہ کر پکارا ہے۔

لہٰذا، سوال اتنا ہی نہیں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے! یہ طے ہو جانے اور سمجھ میں آ جانے کے بعد بھی، اصلی سوال یہ ہوگا کہ کیا وہ لوگ بھی موجود ہیں جن کے ہاتھوں اور جن کے اندر، یہ نظام عملاً متشکل ہوگا۔ یعنی وہ لوگ جن کا خدا کے قانونِ مکافات (حیاتِ آخرت) پر یقین محکم ہو!

☆.....☆.....☆

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

روزے تم پر فرض کئے گئے ہیں

(مفہومُ القرآن، سورۃ البقرہ، آیات 183 تا 188)

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ ﴿۱۸۳﴾ اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ ؕ فَمَنۡ كَانَ مِنۡكُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَهٗ فِدۡیَةٌ طَعَامُ مِسۡكِیۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَهُوَ خَیۡرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۱۸۴﴾ (2:183-184)

لیکن میدانِ جنگ میں ثبات و استقامت کا سوال ہو، یا معاشرتی اور معاشی دنیا میں نظامِ عدل و مساوات کا قیام، یہ صرف اُسی صورت میں ممکن ہے کہ جب تمہیں اپنے آپ پر ضبط ہو۔ یعنی جب کبھی ایسا ہو کہ تمہارے کسی طبیعی (حیوانی) تقاضا اور بلند انسانی قدر میں ٹکراؤ ہو، تو تم اس قدر کو طبیعی تقاضا پر ترجیح دو۔ نیز تم جفاکشی اور مُشقت طلبی کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاؤ۔ اس مقصد کے لئے تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلی اقوام پر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ تم قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرنے کے قابل ہو سکو، اور زندگی کے سفر میں راستے کے خطرات سے محفوظ رہو۔ یہ روزے گنتی کے دنوں کے ہیں (گنتی کا تعین، بجائے خویش، ڈسپلن پیدا کرنے کا موجب ہوتا ہے)۔ پھر، جو کوئی تم میں سے مریض ہو، تو وہ دوسرے دنوں میں اس گنتی کو پورا کر لے۔ لیکن اگر شکل یہ ہو کہ ایک شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی حالتِ سفر میں، لیکن اُس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ روزے کو بہ مشقت نباہ سکتا ہے (تو اُس کے لئے دوسرے اوقات میں روزے پورے کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)۔ اسے چاہئے کہ روزے کے عوض، کسی حاجتمند کی روٹی کا انتظام کر دے (اس سے، کم از کم، معذور اشخاص کا قلبی تعلق، اِس اجتماعی فریضہ کے ساتھ قائم رہے گا)۔

یہ ظاہر ہے کہ اس بات کا فیصلہ قانونی طور پر نہیں کیا جا سکتا کہ تم روزہ بہ مشقت نباہ سکتے ہو۔ یہ چیز تمہارے اپنے فیصلہ کرنے کی ہے۔ لہٰذا اپنی حالت کا جائزہ تم خود لو۔ اگر تم دیکھو کہ صورت بَین بَین ہے، تو پھر تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے، خواہ اس میں (مقابلۃً) تھوڑی سی مشقت بھی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ جو مقصد روزے سے حاصل ہو سکتا ہے وہ اُس کے فدیہ سے نہیں ہو سکتا ___ بشرطیکہ تم روزے کی حکمت سے واقف ہو۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰي سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵ (2:185)

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ اس اجتماعی اور عسکری ٹریننگ (اور تربیتِ نفس) کے لیے رمضان کے مہینے کا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اس لئے کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی تھی ___ وہ قرآن جو تمام نوعِ انسانی کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی ایسی راہ بتاتا ہے جو واضح اور اُبھری ہوئی ہے، اور جو مستقل اقدار کے پیمانے پیش کرتا ہے تاکہ حق اور باطل میں تمیز ہوتی رہے۔ روزوں کا نظم وضبط، اس عظیم پروگرام کے لئے مستعد رہنے کی سالانہ ٹریننگ ہے۔ سو جو شخص، اس مہینے میں، اپنے گھر پر موجود ہو، تو اُسے چاہئے کہ اس مہینے کے روزے رکھے۔ لیکن جو مریض ہو، یا حالتِ سفر میں، تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔ (اور جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتا ہو اس کے متعلق پہلے کہا جا چکا ہے۔ یہ رعایتیں اس لئے ہیں کہ) خدا تمہارے لئے آسانیاں چاہتا ہے، سختی اور تنگی پیدا کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے تم دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لیا کرو۔

پھر سُن لو کہ روزے محض رسم پوری کرنے کے لئے نہیں۔ ان سے مقصد یہ ہے کہ تم اِس قابل ہو جاؤ کہ، خدا نے جو تمہیں راہ نمائی عطا کی ہے، اُس کے ذریعے تم قانونِ خداوندی کو ساری دنیا کے قوانین سے بلند کر سکو (9:33)۔ اور اس مقصد کے لئے تم جو کوشش کرو، وہ بھرپور نتائج کی حامل ہو۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ۭ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ۝۱۸۶ (2:186)

نہ ہی روزوں کے حکم سے، تمہارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہونا چاہئے کہ، مادی لذتوں اور جسمانی ضرورتوں کے ترک کر دینے سے اِنسان خدا کا مُقرب بن جاتا ہے (جیسا کہ مسلکِ خانقاہیت میں، مختلف ریاضتوں اور مشقتوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے)۔ (اے رسول ﷺ! جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق دریافت کریں تو اُن سے کہہ دیں کہ میں ہر وقت ان کے قریب ہوں۔ (وہ اس طرح کہ) جب بھی کوئی شخص، اپنی راہ نمائی کے لئے مجھے پکارتا ہے تو، میرا قانونِ ہدایت جو قرآن کے اندر محفوظ ہے، اُس کی پکار کا جواب دیتا ہے (اور اُبھر کر اُس کے سامنے آجاتا ہے)۔ لہٰذا، اِن سے کہہ دو کہ قُربِ خداوندی کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ میرے قانون کی صداقت پر یقینِ محکم رکھتے ہوئے، اس کی پوری پوری اطاعت کریں (7:56، 8:24، 16-32:15، 40:60، 42:26)۔ یہ ہے وہ طریق جس سے یہ دلائل و براہین کی رُو سے، عقل وفکر کی روشنی میں، زندگی کے صحیح راستے پر پختگی سے چلتے رہیں گے۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے اعمال سے ہوگا (3:194)۔

اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۠ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ (2:187)

یہ بھی سمجھ لو کہ روزہ دن ہی دن کا ہے۔ رات کے وقت نہ کھانے پینے کی ممانعت ہے نہ ہی بیویوں کی طرف رجوع کرنے کی ___ بیویوں سے جنسی اختلاط، ''قربِ خداوندی'' کی راہ میں حائل نہیں ہوسکتا (یہ بھی مسلکِ خانقاہیت کا پیدا کردہ تصوّر ہے)۔ میاں بیوی کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے، اور ایسا قریبی رشتہ کہ اِن کے درمیان کوئی تیسرا حائل نہیں ہوسکتا۔ اللہ جانتا ہے کہ نفسِ انسانی کے تقاضے کیا ہیں اور مسلکِ رہبانیت میں انسان کے دل میں کس کس قسم کے خیالات پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ خود اپنے آپ سے خیانت کرتا رہتا ہے (57:27)۔ لہٰذا، خدا کا قانون، اس بارے میں، اِنسانوں کی خودساختہ حدود سے آگے بڑھتا ہے، اور تمہارے دل میں جو وساوس پیدا ہو رہے تھے، اُن سے درگزر کرتے ہوئے اس کی وضاحت کرتا ہے کہ تم، رات کے وقت، منشائے قانونِ خداوندی کے مطابق، اپنی بیویوں کے پاس بھی جاسکتے ہو اور کھا پی بھی سکتے ہو، تا آنکہ صبح کی سفیدی رات کی سیاہی سے نمایاں ہوجائے۔ اس کے بعد، رات تک روزہ پورا کرو۔ لیکن اگر تم، اِس ٹریننگ کے کسی خاص کورس کے لئے تربیت واطاعت کے مراکز (مساجد) میں رُکے ہوئے ہو، تاکہ تم اُلجھے ہوئے معاملات کو اچھی طرح سُلجھا سکو، تو پھر تم اِن راتوں میں بھی بیویوں سے اختلاط نہ کرو (اور اپنی توجہ کو پوری یک سوئی سے معاملاتِ پیشِ نظر پر مرکوز رکھو)۔

بس یہ ہیں وہ حدود جو اِس باب میں قانونِ خداوندی نے مقرر کردی ہیں۔ اِن کی نگہداشت کرو۔ اس طرح اللہ اپنے احکام وقوانین کو نمایاں طور پر بیان کردیتا ہے تاکہ لوگ اِن کی پوری پوری نگہداشت کرسکیں۔

وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ (2:188)

اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ (جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے) روزے سے مقصد یہ ہے کہ تم میں ایسا ضبطِ نفس پیدا ہوجائے کہ تم، زندگی کے ہر گوشے میں، جائز اور ناجائز میں تمیز کرسکو، اور، خواہ تمہاری مفاد پرستی کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، ناجائز کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو۔ (مثلاً) آپس میں ایک دوسرے کا مال، ناجائز طریق پر نہ کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت تک جاچکا ہے، تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ لے لو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے، حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کے نتائج کیا ہوا کرتے ہیں؟

روزوں سے تمہاری اس قسم کی تربیتِ ذات مقصود ہے۔

ہلالِ عید

غرّۂ شوّال! اے نورِ نگاہِ روزہ دار! آ! کہ تھے تیرے لئے مسلم سراپا انتظار
اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی بستی دیکھ لے! اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے!

قافلے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ رہروِ درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر اے تہی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ
فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ
بارشِ سنگِ حوادث کا تماشائی بھی ہو امتِ مرحوم کی آئینہ دیواری بھی دیکھ
ہاں، تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو اور جو بے آبرو تھے، ان کی خود داری بھی دیکھ
جس کو ہم نے آشنا لطفِ تکلم سے کیا اس حریفِ بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ

صورت آئینہ سب کچھ دیکھ، اور خاموش رہ
شورشِ امروز میں محوِ سرودِ دوش رہ

اقبالؒ

شیخ اللہ دتا ایڈووکیٹ، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اُسوۂ حسنہ (مسلسل)

21 فروری 2021ء کے ''اسوۂ حسنہ'' پر اپنے خطاب میں میں نے بتایا تھا کہ یہ اصطلاح جنگِ احزاب کے متعلق قرآنی فرمودات کے ضمن میں پہلی دفعہ سامنے آئی ہے (33:21) اور اس جنگ میں نبی کریم ﷺ کے کردار کو جماعتِ مؤمنین کے لئے بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اُس وقت یہ بھی وضاحت کی گئی تھی کہ جن مہمات یا یورشوں میں آپ ﷺ نے خود مقصد اور ارادے کے ساتھ شرکت فرمائی، انہیں غزوات کہا جاتا ہے اور جن فوجی دستوں کی سربراہی کسی دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوئی، انہیں سرایا کہا جاتا ہے۔ تاریخ کے مطابق غزوات کی تعداد 26 ہے اور سرایا مہمات 56 ہیں۔ آج ہم ان غزوات و سرایا کا مختصر تذکرہ کریں گے تاکہ آپ جان سکیں کہ سال 2ھ سے 10ھ تک، اس 8 یا نو سال کے عرصہ میں آپ نے قرآنی نظامِ حق قائم کرنے، اسے استحکام عطا کرنے اور باقی رکھنے کے لئے کس قدر تگ و تاز کی۔ قرآنی معاشرہ میں نظامِ ربوبیت کے قیام، نظامِ صلوٰۃ اور نظامِ عدل، معاشرتی اصلاح اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ان کی جدوجہد اس کے علاوہ ہے اور زندگی کے باقی شعبوں میں عمل و انقلاب کے لئے الگ سے نمونہ۔

> آپ ﷺ نے ایک عظیم ماہرِ حربیات کی طرح اپنے ساتھی مجاہدین کی مشق کے لئے تربیت کا انتظام کیا تھا۔ آپ کی ہدایات کے مطابق مروجہ ہتھیاروں مثلاً تیر اندازی، نیزہ زنی، شمشیر زنی اور گھڑسواری کی مشق کرنا مجاہدین کا معمول بن گیا۔ آپ ﷺ نے دوسری مشقوں سے زیادہ تیر اندازی کی اہمیت پر بہت زور دیا۔ آپ ﷺ کو دور مار ہتھیاروں کی اہمیت کا پورا شعور تھا چنانچہ گوپیا سے پتھر برسانے کی تربیت بھی دیتے تھے۔ (یہی تیراندازی آج کل میزائل ٹیکنالوجی کا رُوپ دھار گئی ہے)۔

جنگی نقطۂ نظر سے حفاظتی، دفاعی یا یورشی ضروریات کے لئے مجاہدین کی ایک فوج درکار ہوتی ہے۔ اس کی تربیت کے بغیر کوئی مہم کامیابی سے سرانجام نہیں پاسکتی۔ اس کی حربی ضروریات کیسے اسلحہ کی فراہمی، اس کی تیاری کے اہتمام اور استعمال کی مشقوں سے صلاحیت میں اضافہ کے اقدام کرنا ہوتے ہیں۔ دشمن کی تیاری نقل و حرکت اور سازشوں کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے استعداد کے ساتھ ہر آن تیار اور مستعد رہنے کے لئے بندوبست کی ضرورت پڑتی ہے۔

نبیٔ کریم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ اس ضمن میں کیا کیا اقدام کرتی تھی جس سے بہت تھوڑے عرصہ میں جماعتِ مؤمنین، دنیا میں صفِ اوّل کے جنگ جوؤں سے نہ صرف ٹکرا گئی بلکہ انہیں ہر محاذ پر شکست دی۔ نبیٔ کریم ﷺ نے جو اقدام کئے انہیں ایک نظر دیکھتے ہیں:

عسکری تربیت کی بنیاد:

عسکری تربیت میں جو چیز اوّلین اہمیت کی حامل ہے، وہ ہے مجاہد یا فوجی کا یقینِ محکم اور جذبۂ محرکہ۔ صرف زاویۂ نگاہ کی تبدیلی نہیں بلکہ قلبِ صحیم میں مضبوط ایمان کا استحکام۔ جس طرح صالح خون کی متوازن گردش پر جسم کی بقا و صحت، قوت و توانائی اور نشوونما رقاء کا انحصار ہوتا ہے اسی طرح سچے اور غیر متزلزل ایمان کی کل حیاتِ انسانی میں متوازن گردش ہے اس میں قوت و توانائی، ہیبت و جبروت اور رعب و جلال پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا سچا، صالح اور صاحبِ جلال حرکی ایمان جو کل زندگی پر حاوی ہو، مؤمن مجاہد کو اپنے جان و مال اہل و عیال اور ہر قسم کے مفادات سے زیادہ عزیز ہوتا ہے اور وہ اس کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا۔ نبیٔ کریم ﷺ نے جو مجاہد تیار کیا، اسے پہلے اس ہتھیار سے لیس کیا (9:24) اور پھر دیگر اقدام گئے جو درجِ ذیل ہیں:

1۔ اللہُ اکبر:

ہر مومن کا یہ ایمان تھا کہ اللہ ہی سب سے بڑا ہے۔ کوئی شجاع، جنگجو، سردار مسلح آہن پوش، سوار اللہ سے بڑا نہیں۔ یوں مجاہدِ مومن بے خوف کر دیا گیا تھا۔ وہ کسی بھی حالت میں دشمن سے ڈرتا نہیں تھا اور اس طرح ناقابلِ تسخیر بنا دیا گیا (9:72) اور وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (30:47) سے ہلہ شیری حاصل کرتا تھا۔

2۔ طلبِ شہادت:

ہر مجاہد طلبِ شہادت سے سرشار ہوتا تھا اور خدا تعالیٰ کے ہاں زندگی کا طالب (3:169، 2:154) غازی فتحیاب یا شہید۔ پسپائی کا تصور نہیں تھا تا آنکہ امیر پینترا بدلنے کے لئے ہدایت دے (8:16)۔

> جنگ سے پہلے یا اس کے دوران فوج میں پینترے بدلنے، پسپائی اختیار کرنے یا دشمن کا تعاقب کرنے اور رسد و کمک پہنچانے میں ایسی تیزی، ہوش مندی اور چابک دستی سے نقل و حرکت کہ دشمن ششدر رہ جائے۔ آپ نے اپنی سپاہ کی تربیت و تنظیم حرکت پذیری کے اصول پر ہی کی تھی جس نے اسے ناقابلِ تسخیر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ (8:65؛3:146)۔

3۔ اطاعتِ امیر:

اطاعتِ امیر لازمی تھی۔ انفرادی جرأت کے بجائے امیر کی اطاعت سے نظم و ضبط، اتحاد و یکجہتی یگانگت و ہم آہنگی لازمی قرار دی گئی۔ انفرادی جرأت و بہادری اطاعتِ امیر سے مشروط تھی (4:59)۔

4۔موت سے بے خوفی:

مومت ہر انسان کو ہر صورت آنی ہے کیوں نہ مرگِ باشرف ہو نہ کہ حیاتِ بے شرف۔ یہ ایمان ویقین موت سے بے خوف کر دیتا ہے۔مومن موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑتا ہے۔(3:145؛3:185؛3:154؛4:78؛62:8)۔

5۔مشق وحصولِ استعداد:

مشق سے حصولِ استعداد میں مدد ملتی ہے اور اعضاء اور قلب ایک واحد مشین کی طرح کام کرنے لگ جاتے ہیں۔مشق مسلسل ومتواتر اور اس کی جہت درست اور صالحہ ہو تو اس سے مطلوبہ نتائج پیدا ہوتے ہیں۔آپ ﷺ نے ایک عظیم ماہرِ حربیات کی طرح اپنے ساتھی مجاہدین کی مشق کے لئے تربیت کا انتظام کیا تھا۔آپ کی ہدایات کے مطابق مروجہ ہتھیاروں مثلاً تیراندازی، نیزہ زنی، شمشیر زنی اور گھڑسواری کی مشق کرنا مجاہدین کا معمول بن گیا۔آپ ﷺ نے دوسری مشقوں سے زیادہ تیراندازی کی اہمیت پر بہت زور دیا۔آپ ﷺ کو دور مار ہتھیاروں کی اہمیت کا پورا شعور تھا چنانچہ گوپیا سے پتھر برسانے کی تربیت بھی دیتے تھے۔(یہی تیراندازی آج کل میزائل ٹیکنالوجی کا رُوپ دھار گئی ہے)۔پھر مہمات اور چھوٹے غزوات سے اس کی عملی مہارت چیک ہو جاتی تھی۔(8:60؛8:65؛4:84)۔

6۔ریاضتِ شاقہ:

یہ عسکری تربیت کا ایک لازمی جزو قرار دیا گیا۔اس سے مجاہدین میں قوتِ برداشت پیدا ہوتی ہے جو صبر آزما صورتِ حال اور انتہائی سنگین وخطرناک حالات میں بھی ان کے ہوش وحواس قائم رکھتی ہے۔آپ مجاہدین کو سخت محنت اور مشقت کا خوگر بناتے تھے۔رمضان المبارک کے اور نفلی روزے رکھواتے۔اس سے مجاہدین میں غیر معمولی قوتِ برداشت پیدا ہو گئی۔(8:65؛3:120؛2:250)۔

7۔صف بندی:

انفرادی حملوں اور جرأت کے مظاہرہ کے بجائے صف بندی میں لڑنے کی تربیت کرتے تھے۔متوازی صف بندی کے علاوہ تکون اور حلقہ میں لڑنے سے کم تعداد زیادہ دشمنوں کے مقابل بہت کامیاب رہتی تھی۔حضور ﷺ کے بعد بھی مسلمانوں نے صف بندی اور خصوصاً حلقہ یا سرکل میں لڑنے کو اپنائے رکھا اور بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔(61:4)

8۔طلایہ(Patrol):

فوجی دستوں کے ذریعے دشمن کے علاقوں کی جغرافیائی، سیاسی اور عسکری معلومات حاصل کرنا کامیابی کی بنیاد ہے۔آپ ﷺ کو اس کی غیر معمولی اہمیت کا پورا شعور تھا۔چنانچہ آپ ﷺ مجاہدین کو اس کی مسلسل تربیت دیتے تھے۔

9۔ابتدائی معائنہ۔قراولی(Reconnaissance):

دشمن کی نقل وحرکت اور دیگر عسکری معلومات حاصل کرنا۔اسے بھی آپ کے تربیتی نظام میں غیر معمولی اہمیت حاصل

تھی۔(4:83)۔

10۔عسکری جاسوسی (Espionage):

دشمن کی قوت، تعداد، اس کے منصوبوں اور چالوں، حلیفوں اور ان کے جاسوسوں کا بروقت پتہ چلانا اور قائد کو اطلاعات بھجوانا۔آپ ﷺ کا یہ جاسوسی نظام، اگرچہ بے نام اور غیر مرئی تھا لیکن اس کی کارکردگی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔اس کی اہمیت غیر معمولی ہے۔(4:83)

11۔رازداری:

اپنے فوجی رازوں کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دینا، نہ اپنوں پر نہ بیگانوں پر۔اس کی تربیت خصوصی تھی (3:118)۔

12۔جنگی چالیں:

اپنے طرزِ عمل، پروپیگنڈے۔ بالواسطہ پبلسٹی اور بعض اوقات خاموشی کے ذریعے دشمن کو غافل رکھنا اور اس کی غفلت سے فائدہ اٹھانا۔دشمن کو جُل دینے کے لئے کرنا کچھ دکھانا کچھ۔خود دشمن سے کبھی غافل نہ ہونا۔اس کے متوقع یا اچانک حملے کے لئے ہر وقت چوکس، چاق و چوبند اور تیار رہنا۔(4:59)۔

13۔تعاقبیت:

دشمن کے تعاقب کا فن تاکہ انہیں دوبارہ مجتمع اور منظم ہونے اور صف بندی کا موقع نہ مل سکے اور نہ ہی وہ پلٹ کر حملہ ہی کر سکیں۔جنگِ احد اس کی بہترین مثال ہے(61:4)۔

14۔مکرر صف بندی:

ہزیمت اور انتشار کی حالت میں دوبارہ اکٹھا ہونے، سمجھالا لینے، ہوش و حواس اور صفیں درست کرنے کی قابلیت، جنگِ اُحد اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔(61:4)۔

15۔ترہیب و ترغیب:

دشمن کو برباد کرنے کی بجائے اسے خوف زدہ، مرعوب اور مایوس کر کے ہتھیار ڈالنے یا فرار ہونے اور محصور ہونے پر مجبور کرنا نیز ان کے جنگی کردار کو مضمحل کرنا۔آپ ﷺ کی تربیت سے مجاہدین اس فن میں طاق ہو گئے تھے۔(8:60؛ 9:60)۔

> عسکری تربیت قرآنِ کریم کے نصاب تعلیم و تربیت کا ایک لازمی حصہ ہے اور آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ تھا جس کی بدولت مجاہدین اسلام ناقابلِ تسخیر بن گئے اور ان کے کارناموں کو دیکھ کر تاریخ نے انہیں مثالی سپاہی تسلیم کرلیا۔ اس کی بدولت مسلمان انتہائی مختصر عرصہ میں زندگی کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقی کر کے اقوامِ عالم کو پیچھے چھوڑ گئے اور زمانے نے انہیں قیادتِ عالم تفویض کردی۔ یہ آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کا تاریخی اعجاز ہے۔

16۔ حسن سلوک وترغیب:

دشمن کے قیدیوں سے حسن سلوک اور تالیفِ قلب کرنا تاکہ دشمن نامساعد حالات میں جان پر کھیل جانے پر قید ہونے کو ترجیح دیں۔ جنگِ بدر کے قیدیوں سے حسن سلوک اس کی بہترین مثال ہے۔(8:70)

17۔ قائدانہ تربیت:

مجاہدین میں اوصاف قیادت پیدا کرنا آپ کی تربیت کا ایک امتیازی وصف تھا اس لئے مجاہدین میں قیادت کی صلاحیت ابھر کر سامنے آئی۔

18۔ جنگی سکت کی تربیت (Fighting Stamina)

عسکری صلاحیت کے باوجود اگر جنگی سکت وقوتِ برداشت نہ ہو تو فتح کے امکانات کم ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ مجاہدوں میں سردوگرم، جارحانہ اور مدافعانہ نیز طویل ومختصر جنگوں کی سکت پیدا کرنا آپ ﷺ کی عسکری تربیت کا لازمہ تھا۔(4:84؛8:65)۔

19۔ سپاہیانہ حرکت پزیری (Mobility):

جنگ سے پہلے یا اس کے دوران فوج میں پینترے بدلنے، پسپائی اختیار کرنے یا دشمن کا تعاقب کرنے اور رسد وکمک پہنچانے میں ایسی تیزی، ہوش مندی اور چابک دستی سے نقل وحرکت کہ دشمن ششدر رہ جائے۔ آپ نے اپنی سپاہ کی تربیت و تنظیم حرکت پذیری کے اصول پر ہی کی تھی جس نے اسے ناقابلِ تسخیر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔(8:65؛3:146)۔

عسکری تربیت قرآنِ کریم کے نصاب تعلیم وتربیت کا ایک لازمی حصہ ہے اور آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ تھا جس کی بدولت مجاہدین اسلام ناقابلِ تسخیر بن گئے اور ان کے کارناموں کو دیکھ کر تاریخ نے انہیں مثالی سپاہی تسلیم کرلیا۔ اس کی بدولت مسلمان انتہائی مختصر عرصہ میں زندگی کے ہر شعبے میں حیرت انگیز ترقی کرکے اقوامِ عالم کو پیچھے چھوڑ گئے اور زمانے نے انہیں قیادتِ عالم تفویض کردی۔ یہ آپ ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کا تاریخی اعجاز ہے۔

غزواتِ رسول اللہ ﷺ کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:

مدینہ سے رسول اللہ کے غزوات بعرصہ 8 سال (2 تا 9 ہجری)

نمبر شمار	نام غزوہ	تاریخ		تعداد لشکر		کیفیت
		ہجری	عیسوی	اسلامی	دشمن	
1۔	ودان یا ابواء	12 صفر 2 ہجری	اگست 623ء	70		عمرو بن مخشی الضمری سے معاہدہ غیر جانبداری۔
2۔	بواط (رَضوٰی)	ربیع الاوّل 2 ہجری	اکتوبر 623ء	200	100	ینبوع کے قریب پہاڑ رَضوٰی اور بواط تک ہوکر واپس ہوئے۔ راہ میں قافلہ قریش اُمیہ بن خلف کی سرداری میں ملا۔

3۔	سفوان یا بدر اولی	ربیع الآخر 2ہجری	اکتوبر 623ء	70	کرزین جابرالفہری	کرز بن جابر اہل مدینہ کے مویشی لوٹ کرلے گیا تھا جس کا تعاقب کیا گیا۔ سفوان تک دشمن کا تعاق کیا مگر ہاتھ نہ لگا۔
4۔	عُشَیرہ	جمادی الاوّل 2ہجری	نومبر 623ء	150	بنی مدلج اور بنی ضمرہ	مکہ اور مدینہ کے درمیان ینبوع کی بانب عُشیرہ میں بنی مدلج او ربنی ضمرہ سے معاہدہ ہوا۔
5۔	بدرالکبریٰ	12۔17 رمضان 2ھ	8۔13 مارچ 624ء	313	1000	قریش مکہ ابوجہل کی سربراہی میں حملہ آور ہوئے اور شکست کھائی۔ 70 قتل ہوئے، 70 قید ہوئے، مسلمان 14 شہید ہوئے۔
6۔	بنی قینقاع (یہودی)	15شوال 2 ہجری	10اپریل 624ء	کئی صحابہ	بنوقینقاع 700	جب مسلمان بدر پر گئے ہوئے تھے اس وقت انہوں نے مدینہ کے اندر بلوہ کیا۔ اس لئے جلاوطن کئے گئے جو 700 تھے۔
7۔	السویق	5ذی الحجہ 2ہجری	29مئی 624ء	200	200سوار	ابوسفیان مدینہ تک آیا۔ 2 مسلمانوں کو شہید کیا اور پھلدار درخت کاٹ کر چلا گیا۔ آپ ﷺ نے تعاقب کیا مگر نہ ملا۔
8۔	ذی امر یا غطفان یا انمار	محرم 3ہجری	جون 624ء	450 سوار	بنوثعلبہ وبنو محارب	یہ قبائل جمع ہوئے تھے کہ مدینہ پر حملہ آور ہوں۔ آپ ﷺ نے نجد تک سفر فرمایا۔ دشمن منتشر ہوگیا۔
9۔	بحران یا قرقرۃ الکدر یا بنوسلیم	ربیع الاوّل 3 ہجری	ستمبر۔ اکتوبر 624ء	300	قبیلہ بنو غطفان اینوسلیم	دشمن مدینہ پر حملہ کے لئے فراہم ہوا تھا۔ بھاگ گیا۔
10	اُحد	14شوال 3ھ	29مارچ 625ء	650 پیادہ	2800 پیادہ200 سوار	اُحد مدینہ سے تین میل پر ہے۔ دشمن مکہ سے آیا تھا مسلمان کے 70 آدمی شہید ہوئے اور 40 زخمی۔ دشمن کے 22 قتل ہوئے۔

11۔	حمراء الاسد	15شوال 3ھ	30مارچ 625ء	540	2970	جنگ اُحد سے اگلے دن دشمن کے کیمپ تک صرف اس لئے گئے کہ وہ مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر پھر حملہ نہ کردے۔ دو افراد قیدی بنائے گئے اور شاعر بوعزہ قتل ہوا۔
12۔	بنونضیر	یکم ربیع الاوّل 4ھ	اگست ستمبر 625ء	کئی صحابہ	نبونضیر	ان کے قلعوں کا دو ہفتے محاصرہ کیا اور بہ جرمِ بغاوت واقدام قتل آنحضرت ﷺ شہر سے نکال دیئے گئے۔
13۔	بدرالاخریٰ	ذی قعد 4ھ	اپریل 626ء	1500 پیادہ 100 سوار	2000 پیادہ 50 سوار	ابوسفیان مکہ سے لشکر لے کر طیران یا عسفان تک آیا۔ آپ ﷺ بھی خبر پاکر مقابلہ کے لئے نکلے۔ وہ راستے سے لوٹ گیا۔ مقابلہ نہیں ہوا۔
14۔	دومۃ الجندل	25ربیع الاوّل 5ھ تا 20ربیع الاخر	24اگست تا 18 ستمبر 626ء	1000	باشندگانِ دومہ	دومۃ الجندل میں جمع کثیر کی اطلاع ملی کہ مدینہ پر حملہ کریں گے۔ آپ ﷺ روانہ ہوئے تو پتہ چلا کہ اطلاع غلط تھی۔ واپس تشریف لائے۔ راہ میں عیینہ بن حسین سے معاہدہ ہوا۔
15۔	بنو مصطلق یا مریسیع	2شعبان 5ہجری	28دسمبر 626ء	1600 صحابہ	حارث بن ضرار سردار بنومصطلق	حارث نے مسلمانوں کے خلاف اکٹھ کیا۔ آپ وہاں گئے تو صرف بنومصطلق سے جنگ ہوئی۔ باقی منتشر ہوگئے۔ دشمن کو شکست ہوئی۔ سب قیدی 109 رہا ہوئے
16۔	احزاب یا خندق	شوال۔ذی قعد 5ہجری	مارچ 627ء	3000	10000	ابوسفیان مختلف قبائل سے نفری لیکر حملہ آور ہوا مسلمانوں نے مدینہ کے اندر رہ کر خندق کی پناہ میں مدافعت کی۔ ایک ماہ محاصرہ کے بعد دشمن ناکام واپس ہوا۔

17۔	بنوقریضہ	25ذی الحجہ، 5ھ	15اپریل 627ء	3000 صحابہ	بنوقریضہ محاصرہ 3 ہفتے	بنوقریضہ یہودی تھے اور مسلمانوں کے ساتھ ہم عہد لیکن جنگِ خندق میں بغاوت کے جرم میں اسیر ہوئے پھر ثالث کے فیصلہ بمطابق تورات ہوا تو 400 یہودی قتل ہوئے۔
18۔	بن لحیان	یکم ربیع الاوّل 6ہجری	21جولائی 627ء	200 سوار	بنولحیان شاخ ہذیل	اہل رجیع جنہوں نے دس علماء اسلام کو بے وجہ قتل کیا تھا، ان کی سزا کے لئے یہ حملہ کیا گیا۔ دشمن منتشر ہوگیا۔ مقابلہ نہیں ہوا۔
19۔	وادی ذی قردہ یا غابہ	ربیع الآخر 6ھ	اگست ستمبر 627ء	500 مع سلمہ بن اکوع	بنوغطفان کے سوار	ڈکیتوں کا گروہ آپ ﷺ کے اونٹوں کو لوٹ کر لے گیا تھا۔ مسلمانوں نے تعاقب کر کے سب مویشی چھڑائے۔
20۔	حدیبیہ	یکم ذی قعد 6ھ	13مارچ 628ء	1400	اہل مکہ سہیل بن عمرو	آپ ﷺ عمرہ کی نیت سے تشریف لے گئے۔ مگر قریش نے حدیبیہ جو مکہ سے سات کوس ہے، آگے نہ بڑھنے دیا لیکن دس سال کے لئے قریش کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہوگیا۔ آپ واپس تشریف لے آئے۔
21۔	خیبر	محرم 7ھ	مئی جون 628ء	1400 (2سو سوار)	10000	یہود خیبر مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری میں تھے آپ نے خیبر پہنچ کر ان کے مفسدانہ ارادوں کا سدِ باب کر دیا۔ فتح مبین حاصل ہوئی۔

22۔	وادی القریٰ	محرم 7ھ	جون 628ء	1382	یہودی ساکنان وادی القرای	خفیف مقابلہ کے بعد دشمن کو شکست ہوئی یہودیوں کو ان کی اراضیات پر بطورِ رعایا قابض رکھا گیا۔
23۔	ذات الرقاع	محرم 7ھ	جون 628ء	400	بنوثعلبہ بنوانمار بنو محارب	بنو غطفان چار قبائل کو ساتھ شامل کر کے مسلمانوں پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ مسلمان ان کی سرحد پر پہنچ گئے تو سب منتشر ہو گئے۔
24۔	فتح مکہ	10رمضان 8ھ	یکم جنوری 630ء	10000	اہل مکہ	دو ایک خفیف مناشقوں کے سوا، اسلامی لشکر مکہ میں داخل ہو گیا۔ آپ ﷺ نے شہر فتح ہونے کے بعد سب کو عام معافی دی۔
25۔	حنین یا اوطاس یا ہوازن	شوال 8ھ	جنوری، فروری 630ء	12000	بنوہوازن، بنوثقیف بنو مضر بنو احسم	سخت مقابلہ کے بعد فتح ہوئی۔ 6000 قیدی آپ نے بلا معاوضہ چھوڑ دئے قیدیوں کو کپڑے بھی عطا فرمائے۔
26۔	طائف	ایضاً	فروری 630ء	ایضاً	بنوثقیف	طائف کا محاصرہ کیا گیا۔ 20 دن کے بعد محاصرہ اٹھالیا گیا۔ اس کے بعد لوگ از خود حاضر ہو کر اسلام لائے۔
27	تبوک (جیش العسرت)	رجب 9ھ	نومبر 630ء	30000 10000 سوار	قیصر ہرقل	پتہ چلا تھا کہ قیصر ہرقل مدینہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے تا کہ جنگِ موتہ کا داغ دھویا جائے آپ سرحد پر تشریف لے گئے۔ حربی مظاہرہ کرنے اور دشمن کو مرعوب کرنے کے بعد واپس آ گئے۔

عہدِ نبوی ﷺ میں ایک ہجری تا 10 ہجری (9 سال کے اندر) سرایا کی تفصیل

نمبر شمار	نام سریہ یا جگہ	سربراہی	تاریخ		تعداد لشکر		کیفیت
			ہجری	عیسوی	اسلامی	دشمن	
1۔	سیف البحر	امیر حمزہؓ بن عبدالمطلب	رمضان 1 ہجری	مارچ 623ء	30 مہاجر	300 ابوجہل	یہ سریہ احوالِ مکہ کے تجسس کے لئے بھیجا گیا۔ دشمن نے مسلمانوں کو باخبر پایا اور لوٹ گیا۔
2۔	بطن رابغ	عبیدہ بن الحارث	شوال 1ھ	اپریل 623ھ	60 مہاجر	200	یہ سریہ احوالِ مکہ کے تجسس کے لئے بھیجا گیا تھا ثنیۃ المرہ پر موجود دیکھا گیا۔ صرف گشت لگایا۔
3۔	ضرار (خم غدیر کے قریب)	سعد بن ابی وقاصؓ	ذی قعد 1ھ	مئی 623ء	80 مہاجر	قافلۂ قریش	جحفہ تک گشت لگا کر واپس آئے۔
4۔	وادی نخلہ	عبداللہ بن جحش	رجب 2ھ	جنوری 624ء	12 مہاجر	قافلۂ قریش	مقابلہ ہوا۔ 2 قیدی چھوڑ دئے اور ایک کا خون بہا دیا۔
5۔	مدینہ منورہ	عمیرؓ بن عدی خطمی	رمضان 2ھ	مارچ 624ء	اکیلے عمیر	مسماۃ عصماء بنت مروان	عمیر نے اپنی رشتہ کی بہن کو مخالفتِ رسول اللہ ﷺ کے سبب قتل کر دیا۔
6۔	ابو عکفہ یہودی	سالمؓ بن عمیر انصاری	شوال 2ھ	اپریل 624ء	اکیلے سالم بن عمیر	ابوعکفہ	ابوعکفہ یہودی لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارتا تھا۔ سالم نے مار ڈالا۔
7۔	محمد بن مسلمہ	محمدؓ بن مسلمہ انصاری	14 ربیع الاوّل 3ھ	4 ستمبر 624ء	5	کعب بن اشرف یہودی مدینہ	کعب یہودی قبائل کو مسلمانوں کے خلاف ابھارتا تھا مکہ جا کر قریش کو ابھارا اور جنگِ اُحد ہوئی۔

8۔	قروہ	زیدؓ بن حارثہ	جمادی الآخر 3ھ	اکتوبر نومبر 624ء	100	تجارتی قافلہ	قریش کے تجارتی قافلہ کے رستہ پر مظاہرہ کیا گیا۔ قافلہ کا راہنما فراۃ بن سفیان گرفتار ہوکر مسلمان ہوگیا۔
9۔	قطن	ابومسلمہؓ مخزومی	یکم محرم 4ھ	13 جون 625ء	150	بنواسد طلحہ وسلمہ	یہ مشہور ڈکیت تھے۔ مدینہ پر ڈکیتی کرنا چاہتے تھے۔ جب مسلمان مجاہدین ان کے ٹھکانے قطن پہنچ گئے تو گروہ منتشر ہوگیا۔
10۔	عُرنہ	عبداللہؓ بن انیس الجہنی الانصاری	5 محرم 4ھ	17 جون 625ء	عبداللہ بن انیس	سفیان بن خالد ہذلی	عبداللہ نے سنا تھا کہ سفیان نے مسلمانوں کے خلاف جمعیت فراہم کی ہے۔ عبداللہ وہاں پہنچا اور سفیان کو مار ڈالا۔
11۔	رجیع	عاصمؓ بن ثابت یا مرثد بنؓ ابی مرثد الغنوی	صفر 4ھ	جولائی اگست 625ء	10	قبیلہ عضل اور قارہ 200 (100 تیر انداز)	دس واعظین اسلام کو شہید کیا گیا۔ اس قبیلہ کے لوگ بہانہ سے واعظین کو ساتھ لے گئے اور دھوکے سے 8 مسلمان شہید کئے۔ 2 کو مکہ میں فروخت کیا جہاں انہیں شہید کردیا گیا۔
12۔	بیر معونہ یا طرز	منذرؓ بن عمرو	صفر 4ھ	جولائی اگست 625ء	70	ایک بڑی جماعت عامر بن مالک قبائل رعل اور ذکوان وبنو مسلمہ	عامر بن مالک خدمتِ نبوی ﷺ میں آیا اور کہا کہ میرا علاقہ اسلام کے لئے آمادہ ہے۔ کچھ واعظ ساتھ بھیج دئے جائیں۔ آپ ﷺ نے 70 عالم ساتھ کردیئے جب وہ ان کے علاقہ میں پہنچے تو قبائل نے حملہ کردیا۔ 69 واعظین شہید ہوئے صرف عمرو بن امیہ الضمری بچ کر آئے۔

	قبیلہ ٔ بنو کلاب	عمروؓ بن اُمیہ	ربیع الاوّل 4ھ	ستمبر 625ء	1	2		عمرو بن اُمیہ جوستر واعظین سے بچ کر مدینہ آرہے تھے۔انہوں نے دوشخصوں کوسوتے پایا اور غلطی سے قاتلوں کی جماعت سے سمجھ کرقتل کر ڈاالا۔یہ قبیلہ بنوکلاب جودواستدارتھا سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ ﷺ نے دونوں کا خون بہاادا کیا۔
13۔	قرطاء (نجد)	محمدؓ بن مسلمہ انصاری	10محرم 6ھ	یکم جون 627ء	30	20ثمامہ بن اثال		محمد بن مسلمہ نے ثمامہ کوجانب مدینہ آتے دیکھاتوراستہ گھیر کرگرفتارکرلیا آپ نے ثمامہ کو رہا کردیا تو وہ مسلمان ہوگیا۔
14۔	غمر مرزوق	عکاشہؓ بن محصن الاسدی	ربیع الآخر 6ھ	ستمبر 627ء	40	بنواسد		بنو اسد نے نے مدینہ پرحملہ کے لئے جمعیت فراہم کی تھی۔ 40 مجاہدین کا طلایہ گیا دشمن منتشر ہوگیا۔200اونٹ ملے۔
15۔	ذی القصہ	محمدؓ بن مسلمہ	ربیع الآخر 6ھ	ستمبر 627ء	10	100بنو ثعلبہ		دس عالمان دین ہدایت کے لئے گئے تھےوہ سوئے پڑے تھے کہ بنو ثعلبہ دشمن نے حملہ کردیا۔ 9 عالم شہیداورمحمد بن مسلمہ زخمی ہوئے۔
16۔	بنوثعلبہ	ابوعبیدہؓ بن جراح	ربیع الآخر 6ھ	ستمبر 627ء	40	بنوثعلبہ		شہدائے مقام ذی القصہ کا انتقام لینے گئے تھے دشمن بھاگ گیا۔ سامان پرقبضہ ہوا۔
17۔	جموم	زیدؓ بن حارثہ	ربیع الآخر 6ھ	ستمبر 627ء	چندصحابہ	بنوسلیم		ایک عورت نے جھوٹی مخبری بنوسلیم کے خلاف کردی تھی۔ چند آدمی گرفتارہوئے آپ نے سب کوچھوڑ دیااورمخبریہ کےخاوندکوبھی۔

18۔	عیص	زیدؓ بن حارثہ	جمادی الاولیٰ 6ھ	ستمبر اکتوبر 627ء	70	قافلہ قریش	مجاہدین نے قافلہ والوں کو گرفتار کرلیا۔ ان میں آپ ﷺ کے داماد ابو العاص بھی تھے جنہیں حضرت زیبؓ نے پناہ دی تھی۔ آپ نے رہا کردیا
19۔	طَرَف	زیدؓ بن حارثہ	جمادی الآخر 6ھ	اکتوبر 627ء	15	بنوثعلبہ	مجرمان ذی القصہ کی سزادہی کو گئے دشمن بھاگ گیا۔ 20 اونٹ ملے۔
20۔	حسمی	زیدؓ بن حارثہ	جمادی الآخر 6ھ	نومبر 627ء	500	بنوجذام	دشمن مغلوب ہوا۔
21۔	وادیٔ قریٰ	زیدؓ بن حارثہ	رجب 6ھ	نومبر دسمبر 627ء	12	بنی فزارہ	بنی فرازہ نے وادی قریٰ میں اچانک حملہ کرکے 9 کوشہید کیا اور ایک کوزخمی۔
22۔	دومتہ الجندل	عبدالرحمٰنؓ بن عوف	شعبان 6ھ	جنوری 628ء	700	دومتہ الجندل کے عیسائی	مقصد تبلیغ اسلام تھا۔ تین دن کی تبلیغ سے عیسائی رئیس اصبغ بن عمر اور اکثر لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔
23۔	فدک	علیؓ ابن ابی طالب	شعبان 6ھ	جنوری 628ء	200	بنی سعد بن بکر	انہوں نے یہود کی مدد سے فدک کے قریب ایک لشکر جمع کیا۔ مجاہدین نے تیزی سے ان کو جالیا۔ وہ بھاگ گئے۔
24۔	بنی فزارہ یا اُمّ قِرفہ وادی قریٰ	زیدؓ بن حارثہ ابوبکرؓ صدیق	رمضان 6ھ	جنوری فروری 628ء	کئی صحابہ	بنوفزارہ	بنوفزارہ نے زید بن حارثہ پر حملہ کرکے انہیں زخمی کیا تھا اور مال چھینا تھا ان کی سرکوبی کی گئی۔
25۔	خیبر	عبداللہؓ بن عتیک	رمضان 6ھ	فروری 628ء	5	ابورافع نضری	

26۔	خیبر	عبداللہؓ بن رواحہ	شوال 6ھ	مارچ 628ء	30	اُسَیر بن رِزَام		اُسیر 30 آدمیوں کے ساتھ مدینہ کے لئے روانہ ہوا لیکن یہود بگڑ گئے اور ایک کے سوا سب مارے گئے۔
27۔	عُرَینہ	کرزؓ بن جعفر الفہری	شوال 6ھ	مارچ 628ء	20 سوار		8	عکل اور عرینہ کے لوگ بیماری کی حالت میں مدینہ آئے۔ صحتیاب ہو کر جنگل میں رہنے لگے۔ موقع پر آپ ﷺ کے مولیٰ یسار نوبی کو قتل کر کے اونٹ لے گئے پکڑے گئے اور مارے گئے۔
28۔	عیص	ابوجندلؓ وابوبصیرؓ	صفر 7ھ	جولائی 628ء	2	قافلۂ قریش		ابوجندل مکہ میں مسلمان ہو کر قید ہوا اور بھاگ کر شام اور مکہ کے درمیان ایک پہاڑ پر جا ٹھہرا اس نے ساتھیوں کی مدد سے قریش کا قافلہ لوٹ لیا لیکن آپ ﷺ نے سامان واپس کرا دیا۔
29۔	کدید	غالبؓ بن عبداللہ لیثی	صفر 7ھ	جولائی 628ء	60	بنوملوح		بنوملوح نے صحابی بشیر بن سوید کو قتل کر دیا تھا اس کی تنبیہ کے لئے یہ مہم بھیجی گئی۔
30	فدک	غالبؓ بن عبداللہ لیثی	صفر 7ھ	جولائی 628ء		اہل فدک		دشمن کے کچھ لوگ مارے گئے۔
31۔	حسمی	زیدؓ بن حارثہ	جمادی الآخر 7ھ	نومبر 628ء	500	102 ہنید بن عوص جزری		وحیہ کلبی آپ کے سفیر ہرقل سے مل کر واپس آ رہے تھے کہ ہنید نے ان کو لوٹ لیا ان ڈکیتوں کی گرفتاری سزا کے لئے یہ مہم گئی۔ ہنید اور اس کا بیٹا مارا گیا۔

32	تُرَبہ	عمرؓ بن خطاب	شعبان 7ھ	جنوری 629ء	30	ہوازن		تُربہ مکہ سے دو منزل پر ہے۔ ان لوگوں نے بنوغطفان کی مدد کی تھی۔ عسکری مظاہرہ کیا گیا۔
33۔	بنو کلاب نجد	ابوبکرؓ الصدیق	شعبان 7ھ	جنوری 629		بنوکلاب		یہ لوگ بنو محارب اور بنو انمار کے ساتھی تھے اور مسلمانوں پر حملہ کی تیاری کررہے تھے کچھ مرے کچھ قید ہوئے باقی بھاگ گئے۔
34۔	فدک	بشیرؓ بن سعد انصاری	شعبان 7ھ	جنوری 629ء	30	بنومُرّہ		
35۔	میفعہ (بطنِ نخل)	غالبؓ بن عبداللہ لیثی	رمضان 7ھ	فروری 629ء	130	بنوعوال اور بنوعبد بن ثعلبہ		یہ لوگ اہل خیبر کے ساتھی تھے۔ خفیف لڑائی ہوئی
36۔	فزارہ وعذرہ	بشیرؓ بن سعد انصاری	شوال 7ھ	مارچ 629ء	30	اہل فزارہ وعذرہ		یہ لوگ اہل خیبر کے ساتھی تھے۔ تنبیہ مراد تھی لیکن سب مسلمان تیروں سے زخمی ہوئے۔ دشمن کے 2 آدمی گرفتار ہوئے۔
37۔	بنوسلیم	ابن ابوالعوجاؓ	ذی الحجہ 7ھ	مئی 629ء	50	بنوسلیم		لڑائی میں ابن ابوالعوجا زخمی ہوئے باقی سب شہید ہوگئے۔
38۔	ذات اطلح بنوقضاعہ	کعبؓ بن عمیر انصاری الغفاری	ربیع الاوّل 8ھ	اگست 629ء	15	ساکنان ذات اطلح		یہاں کے لوگ کثیر تعداد میں تھے۔ سب مسلمان شہید ہوگئے صرف ایک مجاہد جانبر ہوئے۔
39۔	موتہ	زیدؓ بن حارثہ، جعفرؓ بن ابی طالب۔ عبداللہؓ بن رواحہ۔ خالدؓ بن ولید	جمادی الاوّل 8ھ	اکتوبر 629ء	3000	ایک لاکھ شرجیل غتانی		آپؐ کے سفیر حارث بن عمر ازدی کو شرجیل نے قتل کرادیا تھا۔ اس لئے جنگ ہوئی۔ تین کمانڈروں سمیت 12 مجاہد شہید ہوئے۔ خالدؓ بن ولید سیف اللہ بقیہ فوج کو بچا کر لے آئے۔

40۔	ذوالخلصہ کعبۂ یمانیہ (قبیلہ خثعم)	جریرؓ بن عبداللہ			150 سواراز قبیلۂ احمس	قبیلۂ خثعم کا بت	بروایت صحیح بخاری جریرؓ بن عبداللہ سے حضور ﷺ نے ذوالخلصہ بت سے نجات دلانے کا کہا وہ قبیلہ احمس کے 150 سواروں کے ساتھ گئے اور بت کو جلا دیا اور وہاں جس کو پایا قتل کر دیا۔
41۔	ذات السلاسل	عمروؓ بن العاص قریشی السہمی	جمادی الآخر 8ھ	نومبر 629ء	500	بنو قضاعہ مقیم ذات السلاسل	بنو قضاعہ مدینہ پر حملہ کے لئے جمع ہوئے تھے۔ عمرو بن العاص کی دادی اس علاقہ کی تھیں وہ اس علاقہ سے واقفہ تھے۔ دشمن منتشر ہو گیا۔
42۔	سیف البحر	ابوعبیدہؓ بن الجراح	رجب 8ھ	دسمبر 629ء	300	قریش	سمندر کے کنارے چند روز ٹھہر کر واپس آ گئے
43۔	محارب	ابوقتادہؓ الانصاری	شعبان 8ھ	دسمبر 629ء	15	بنو غطفان مقیم خضرہ نجد	بنو غطفان مقام خضرہ پر جمع ہو رہے تھے۔ دشمن بھاگ گیا۔ کچھ مویشی ملے۔
44۔	نخلہ (عُزّٰی بت)	خالدؓ بن ولید	رمضان 8ھ	جنوری 630ء	30 سوار	نخلہ میں عزّٰی بت	عزّٰی بت کو گرانے کے لئے گئے۔
45۔	بت خانہ سواع	عمروؓ بن العاص	رمضان 8ھ	جنوری 630ء	کئی صحابہ	بنو ہذیل کا بت سواع	سواع بنو ہذیل کا بت تھا جسے عمرو بن العاص نے توڑا۔
46۔	مشلّل۔ منات بت	سعدؓ اشہلی الانصاری	رمضان 8ھ	جنوری 630ء	20 سوار	منات بت	منات قبیلہ اوس اور خزرج کا بت تھا سعد اشہلی نے توڑا۔
47۔	نبوخزیمہ	خالدؓ بن ولید	شوال 8ھ	فروری 630ء	350	مکہ کے جنوب میں بنوخزیمہ	خالد بن ولیدؓ تبلیغ کے لئے گئے تھے لیکن شک کی بنا پر ان کے 95 افراد قتل کئے حالانکہ وہ اسلام لا چکے تھے۔ آپ نے ان کا خون بہا ادا کیا۔

48۔	ذوالکفین بت	طفیلؓ بن عمر دوسی	شوال 8ھ	فروری 630ء	کئی صحابہ	ذوالکفین بت	ذوالکفین بت گرادیا گیا۔
49۔	بنوتمیم	عیینہؓ بن حصن فزاری	محرم 9ھ	اپریل 630ء	50	قبیلہ بنوتمیم	اس قبیلہ نے ماتحت قبائل کو بہکایا اور ادائے خراج سے منع کیا۔ پھر عیینہ کے جانے سے بھاگ گئے۔ وہ 11 مرد اور 21 عورتیں 30 بچے قید کرلائے۔ جب ان کے سردار مدینہ میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ نے سب قیدیوں کو چھوڑ دیا۔
50۔	تبالہ	قطبہ بن عامر بن حدیدہ	صفر 9ھ	مئی 630ء	20	بنوخثعم	مسلمانوں کے خلاف سازش کررہے تھے۔ کچھ لوگوں کو قیدی بنایا گیا لیکن آپ نے ان کو چھوڑ دیا۔
51۔	زج لاوہ	ضحاک بن سفیان کلابی	ربیع الاوّل 9ھ	جون، جولائی 630ء	کئی صحابہ	قبیلہ بنوکلاب	بنوکلاب کی تعلیم کے لئے بھیجے گئے مسلمان کی انہوں نے مزاحمت کی۔ مقابلہ ہوا۔
52۔	ساحل جدہ	عبداللہ بن حذافہ القرشی السہمی	ربیع الآخر 9ھ	جولائی، اگست 630ء	300	حبشی جماعت بحری ڈکیت	بحری ڈکیت تھے۔ ساحل پر جمع ہوئے تھے تاکہ مکہ پر حملہ کریں۔ مجاہدین کے جانے سے منتشر ہوگئے۔
53۔	بنوطے	علیؓ بن ابی طالب	ربیع الآخر 9ھ	جولائی اگست 630ء	100 50 سوار	بنوطے فلس کی طرف جو بت تھا	مقابلہ ہوکر فتح ہوئی۔ آپ ﷺ نے اس کو چھوڑ دیا اور دختر حاتم کو رہا کرکے رخصت کیا (جس کا نام سمانہ تھا)
54۔	عذرہ اور بلئی کا علاقہ	عکاشہ بن محصن اسدی	ربیع الآخر 9ھ	جولائی اگست 630ء	کئی صحابہ	قبائل	مقابلہ نہیں ہوا۔

55۔	دومتہ الجندل	خالدؓ بن ولید	ربیع الاوّل 10ھ	جون 631ء	420	دومتہ الجندل کے عیسائی	اکیدر والئی دومتہ الجندل قید اور اس کا بھائی قتل ہوا اکیدر کو آپ ﷺ نے بحال کر دیا عیسائی حکومتوں کے ساتھ معاہدے کئے گئے۔
56۔	یمن	علیؓ ابن ابی طالب	رمضان 10ھ	دسمبر 631ء	300 سوار	مذحج	مسلمانوں کو غلبہ حاصل ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کے غزوات اور ان کے دورِ مدینہ کے سرایا کی تفصیل آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ اس تفصیل کی فراہمی میں درجِ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے:

1۔ صحیح بخاری شریف (کتاب المغازی)۔ جلد دوم شائع کردہ دارالاشاعت۔ کراچی

2۔ رحمۃ للعلمین تالیف قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری شائع کردہ مکتبہ اسلامیہ۔ لاہور

3۔ اطلس القرآن تالیف ڈکٹور شوقی ابوخلیل شائع کردہ دارالسلام۔ لاہور

4۔ پیغمبرِ اعظم و آخر ﷺ تالیف ڈاکٹر نصیر احمد ناصرؔ شائع کردہ فیروز سنز۔ لاہور

5۔ سیرتِ احمد ﷺ مجتبیٰ (تین جلدیں) سیرت نگار شاہ مصباح الدین شکیل ناشر پاکستان سٹیٹ ایل کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی

6۔ تاریخ الامت جلد اوّل (سیرتِ الرسول ﷺ) از علامہ محمد اسلم جیراجپوری۔ ناشر میزان پبلی کیشنز۔ لاہور

7۔ معراجِ انسانیت تالیف علامہ غلام احمد پرویز ناشر طلوعِ اسلام ٹرسٹ۔ لاہور

جہاں تک صحیح بخاری شریف کا تعلق ہے اس میں کتاب المغازی کے شروع اور آخر میں صحابیٔ رسول زید بن ارقمؓ کے حوالہ سے حدیث نمبر 1127ء اور نمبر 1586ء میں بتایا گیا ہے کہ نبیٔ کریم ﷺ نے انیس غزوات میں شرکت فرمائی جبکہ خود صحیح بخاری میں یوم حنین کے علاوہ 20 مہمات کے ساتھ غزوہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایک جگہ (حدیث نمبر 1483 میں) غزوۂ ذوالخلصہ کا ذکر ہے جو غزوہ نہیں بلکہ سریہ تھا جریرؓ بن عبداللہ کی سرکردگی میں اس لئے زیرِ نظر فہرست میں اسے سرایا میں شمار کیا گیا ہے۔

غزوات و سرایا کی فہرستوں کا انحصار کتاب اطلس القرآن (جس کی بنیاد طبقات ابن سعد پر ہے) اور ''رحمۃ العالمین'' پر کیا گیا ہے۔ ہجری اور عیسوی تاریخوں کے لئے ''رحمۃ العالمین'' اور ''پیغمبر آخر و اعظم'' کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ جس جگہ عیسوی تاریخ لکھی ہوئی نہیں ملی وہاں سن ہجری اور عیسوی کے تقابل سے مہینوں کا حساب لگایا گیا ہے۔

تفاصیل کے مطالعہ کے دوران مندرجہ بالا گزارشات کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔

مندرجہ بالا غزوات نبوی ﷺ وسرایا میں کتبِ تاریخ سے متفقہ طور پر یہ بات ثابت ہے کہ ان میں مسلمانوں کے کل 259 افراد شہید ہوئے اور مخالفین کے کل 759 افراد قتل ہوئے۔ میزان 1018۔ اتنے بڑے ملک میں اسلامی نظام کے قیام اور امن وامان کی بحالی کے لئے ان قطراتِ خون کا شمار چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ پھر ان میں غیر مصافی آبادی کا ایک بھی فرد شامل نہیں۔ اہل مغرب کی طرف سے وحشت و بربریت کی ان خونچکاں داستانوں کی کچھ حیثیت نہیں جو وہ اسلام کے ابتدائی دور کے متعلق مشہور کر کے تہذیبوں میں تصادم کی راہ ہموار کرتے رہتے ہیں۔

تیغ بہرِ عزتِ دین است وبس۔ مقصدِ اُو حفظِ آئین است وبس!

ملتان کے احباب کے لیے ضروری اطلاع

اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے

ملک محمد صفدر ایڈووکیٹ نمبر 54 محمڈن بلاک ضلع کچہری۔ ملتان فون نمبر: 0334-6093266

فیصل آباد کے احباب کے لئے ضروری اطلاع

اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین

فیصل آباد میں ہماری دو بزموں کے علاوہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھی مل سکتے ہیں۔

فون نمبر: 0322-6386991

حکیم عبدالمجید ہاؤس نمبر P-1479 سٹریٹ نمبر 1، محلہ فتح آباد، فیصل آباد

شیخوپورہ کے احباب کے لئے ضروری اطلاع

شیخ اورنگزیب واثق صاحب کے ہاں طلوعِ اسلام کا لٹریچر دستیاب ہے۔

رابطہ: 0301-4425681

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فرقہ بندی
قرآنِ کریم کی رو سے شرک ہے

قرآنِ کریم نے مسلمانوں کو ایک ایسی قوم قرار دیا ہے، کہ جو تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگراں ہو اور ان کی مرکزی اتھارٹی اور حاکم اعلیٰ ان کا نگراں ہو۔ چنانچہ فرمایا: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ (2:143) اور اس طرح ہم نے تمہیں اُمت وسطیٰ بنایا ہے، کہ تم لوگوں پر نگران بنو اور پیغمبر تم پر نگران بنے۔

قرآنِ کریم اُمت مسلمہ پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ پوری دنیا میں تمام اقوام کی نگرانی کرے اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ اُمت مسلمہ کے پاس اتنی قوت اور طاقت ہو کہ وہ ہر قوم کو عدل وانصاف پر قائم رہنے پر مجبور کرے اس طاقت کے ذریعہ زیادتی کرنے سے روک دے۔ یہ قوت وطاقت اور یہ بلند مقام حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان خود آپس میں اتحاد واتفاق قائم رکھیں۔ اسی لئے قرآن کریم نے مسلمانوں کو اخوہ قرار دیا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (49:10) یقیناً سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان کا فرض ہے کہ بھائیوں کی طرح پیش آئیں۔ اگر ان میں آپس میں دو فریقوں میں کوئی اختلاف ہو جائے تو باقی مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ ان کا اختلاف دور کرا کر ان کے مابین صلح کرا دیں (49:9) قرآنِ کریم مسلمانوں کے آپس کے اختلاف کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کرتا اور اس اختلاف کے واقع نہ ہونے کا ذریعہ قرآنِ کریم سے تمسک قرار دیتا ہے۔ اس لئے حکم ہوتا ہے: وَاعْتَصِمُوْا

> فرقہ بنتا بھی اس وقت ہے جب اللہ کی رسی ہاتھ سے چھوٹتی ہے۔ جب تک اللہ کی رسی ہاتھ میں رہے گی فرقہ نہیں بنے گا، فرقہ صرف اسی صورت میں بنتا ہے جب اللہ کی رسی قرآن کریم کو چھوڑ دیں اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کی اصل وجہ اور بنیادی سبب قرآنِ کریم کو ترک کرنا ہے اور فرقہ پرست کا کوئی تعلق قرآن کریم سے نہیں رہتا۔

بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (3:103) اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور فرقے نہ بنانا۔ اس آیت کریمہ میں مسلمانوں کو تاکیدی حکم ہے کہ قرآنِ کریم سے متمسک رہنا اور فرقہ نہ بنانا۔ آیت کے الفاظ واضح اور بہت موثر ہیں۔ آیت کا پہلا حصہ مؤجبہ اور دوسرا سالبہ ہے۔ یعنی پہلے حصے میں یہ امر ہے کہ قرآن کو مضبوطی سے پکڑے رہنا اور دوسرے حصے میں ہے کہ فرقہ نہ بننے دینا اسی طرح آیت کے مفہوم کو بہت Forcefully بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور فرقہ نہ بنانا۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے۔ کہ فرقہ بنتا بھی اس وقت ہے جب اللہ کی رسی ہاتھ سے چھوٹتی ہے۔ جب تک اللہ کی رسی ہاتھ میں رہے گی فرقہ نہیں بنے گا، فرقہ صرف اسی صورت میں بنتا ہے جب اللہ کی رسی قرآن کریم کو چھوڑ دیں اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کی اصل وجہ اور بنیادی سبب قرآنِ کریم کو ترک کرنا ہے اور فرقہ پرست کا کوئی تعلق قرآن کریم سے نہیں رہتا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا: وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ۭ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (30:31-32) اور مشرکوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود فرقے ہو گئے اور سب فرقے اسی میں خوش ہیں جو ان کے پاس ہے۔ اس آیت شریفہ میں قرآن کریم میں فرقہ بندی کی مذمت کے سلسلہ میں ارشاد ہوا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ۭ (6:159) جن لوگوں نے اپنے دین میں فرقے بنا لئے اے نبی ان سے تمہارا کوئی واسطہ نہیں۔

> انسان کی آخری حالت موت کے وقت کی ہوتی ہے۔ جس وقت ہر مرنے والے کی انتہائی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کا پروردگار اس کا رب کریم اس سے راضی ہو۔ اس عین موت کے وقت کے لئے فرمایا کہ: وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (3:102) اور تم مرنا تو صرف مسلمان ہی مرنا۔ آخری حالت میں مسلمان ہی ہونا چاہئے۔ کسی فرقے کے نام سے منسوب ہونا مناسب نہیں۔

اس آیت کریمہ سے ظاہر ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا رسول ﷺ سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ ان تین آیات کریمات (3:103؛ 30:32؛ 6:159) سے علی الترتیب ثابت ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق نہ قرآنِ کریم سے رہتا ہے اور نہ اللہ و رسول ﷺ سے۔ فرقہ بندی کرنے والے اور کسی ایک فرقہ کو اختیار کرنے والے اپنے زعم میں وہ کتنا ہی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار قرار دے دیں لیکن قرآنِ کریم کی رو سے ان کا کوئی تعلق بوجہ شرک اللہ، رسول ﷺ یا کتاب سے برقرار نہیں رہتا۔ قرآنِ کریم ان قطع علائق پر بس نہیں کرتا۔ مزید ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (3:105) اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے فرقے بنا لئے اور احکام آنے کے بعد ایک

دوسرے سے اختلاف کرنے لگے، یہ وہ لوگ ہیں جن کے لئے عذاب عظیم ہے۔ اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کے خلاف واضح احکامات آنے کے بعد بھی اگر فرقہ بندی کی گئی، تو فرقہ بندی کرنے والوں کے لئے عذاب عظیم ہے۔ قرآنِ کریم نے عذاب الٰہی کی یہ مختلف شکلیں بھی خود ہی شمار کرادی ہیں۔

1۔ دنیاوی زندگی میں ذلت اور خواری اللہ کا عذاب ہے (20:134)۔

2۔ بھوک وخوف اللہ کا عذاب ہے (16:112)۔

3۔ برکات سماوی اور ارضی کے لئے دروازوں کا بند ہوجانا عذاب ہے (7:96)۔

4۔ گروہ بندی اور پارٹی بازی عذاب ہے (6:65)۔

5۔ باہمی اختلاف عذاب ہے۔ (3:104) اور اختلاف کا دور ہونا رحمت (11:118)۔

یہ عذاب الٰہی کی چند شکلیں ہیں اسی طرح قرآنِ کریم نے ان تمام مصائب و بلیات کو جو فرعون کی قوم اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر کرتی تھی عذاب کے لفظ سے تعبیر کیا ہے (20:47) قرآنِ کریم نے مندرجہ بالا آیت کریمہ نمبر (3:105) میں آگاہ کردیا ہے کہ جو قوم بھی فرقہ بندی کرے گی اس کے لئے عذاب عظیم ہے اور قرآنِ کریم نے عذابِ عظیم کی مختلف شکلیں خود بیان فرمادی ہیں جو فرقہ بند قوم پر وارد ہوتی ہیں اور عملاً ہماری قوم فرقہ بندی کی وجہ سے عذاب کی ان تمام کیفیتوں میں مبتلا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم میں اب تک اس کا احساس نہیں (اختصار کی وجہ سے آیات درج نہیں کی گئیں، قرآنِ کریم کے کسی نسخے سے آیات تلاش کرلی جائیں)۔

انسان کی آخری حالت موت کے وقت کی ہوتی ہے۔ جس وقت ہر مرنے والے کی انتہائی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کا پروردگار اس کا رب کریم اس سے راضی ہو۔ اس عین موت کے وقت کے لئے فرمایا کہ: وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (3:102) اور تم مرنا تو صرف مسلمان ہی مرنا۔ آخری حالت میں مسلمان ہی ہونا چاہئے۔ کسی فرقے کے نام سے منسوب ہونا مناسب نہیں۔

قرآنِ کریم میں ہے کہ تم ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہو اور انہوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔ حضور ﷺ نے خود کو بھی اوّل المسلمین فرمایا ہے۔ اس لئے ہمیں بھی قرآن کے حکم اور حضور ﷺ کی اتباع میں خود کو مسلمان کہنا اور کہلوانا چاہئے اور جو لوگ اتباع سنت کا ادعا بہت جوش وخروش سے کرتے ہیں ان کے لئے تو ازبسکہ لازم ہے کہ وہ صرف مسلمان کہلائیں۔ اور کسی بھی فرقے سے منسلک نہ ہوں۔ فرقہ بندی کے متعلق نہایت مختصر الفاظ میں قرآنِ کریم کا موقف بیان کیا گیا ہے کہ قرآن کریم فرقہ بندی کی کس قدر مذمت کرتا ہے لیکن حیرت اور تاسف کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں فرقہ بندی نہ صرف موجود ہے بلکہ اس کو درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہر عالم، ہر مسجد، ہر جامع، ہر مدرسۃ العلوم کسی نہ کسی فرقہ کے ساتھ منسوب ہے اور جتنا بڑا عالم ہوتا

ہے اسی نسبت سے وہ اپنے فرقہ میں متشدد اور غالی ہوتا ہے اور ان تمام واضح آیات کریمات کے باوجود جو درج کی گئیں ہیں، فرقہ بندی کی لعنت سے صرف نظر کرتا ہے کہا جاتا ہے کہ فرقہ بندی کے خلاف کوئی اعتراض نہیں اعتراض صرف اس بات پر ہے کہ فرقے آپس میں تنازعات نہ کریں بلکہ ایک دوسرے سے رواداری سے پیش آئیں۔ لیکن یہ بات قرآنِ کریم کے بھی خلاف ہے اور عملاً بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ فرقے بننے کے بعد ہر فرقہ یہی سمجھتا ہے کہ وہ درست ہے اور دوسرا فرقہ غلطی پر ہے۔ اس لئے فرقہ بندی کے بعد رواداری بالکل ممکن نہیں ہے۔ غور کرنے کی اصل بات یہ ہے کہ فرقہ بنتا کیسے ہے اور فرقہ بندی کا تدارک کیا ہے؟ اور فرقہ کی تعریف کیا ہے؟

قرآنِ کریم چونکہ ایک ابدی اور عالمگیر کتاب ہے اس لئے جو نظامِ حیات وہ پیش کرتا ہے اس میں اس نے بہترین معاشرے کی تشکیل کے لئے صرف اصول بیان کئے ہیں جن کی جزئیات ہر زمانہ کی اسلامی حکومت اپنے اپنے ادوار اور ضروریات کے مطابق خود متعین کرتی ہے۔ صدرِ اوّل میں حضور ﷺ کے دور میں اور خلافت راشدہ کے دور میں اس کی جزئیات حکومت کی طرف سے مقرر ہوتی رہیں اور ان کا اجراء ہوتا رہا۔ انسانیت کی بدقسمتی سے وہ نظام ختم ہو گیا اور ملوکیت کو غلبہ حاصل ہو گیا، اس میں دنیاوی امور بادشاہ خود طے کرنے لگے اور دینی امور دینی ماہرین سے مخصوص ہو گئے۔ چونکہ مختلف حضرات نے اپنی اپنی بصیرت کے مطابق قرآنِ کریم کی جزئیات مقرر کیں اس لئے ان میں وقت ومقامات اور ذاتی میلانات کے مختلف اختلاف کی وجہ سے ان جزئیات میں بھی اختلاف ہوا۔ یہ جزئی قوانین جو ان حضرات نے وضع فرمائے تھے یہ اس دور کی شریعت اور فقہ تھے۔ یہ شریعت اور فقہ ابدی حیثیت کے حامل نہیں تھے۔ نہ ہی اس کے مدون کرنے والوں کا یہ خیال تھا ابدیت اور ہمیشگی اور استقلال تو صرف قوانین الٰہی کے لئے مخصوص ہے اور ہم صرف اسی کی اتباع کے مکلف ہیں۔ اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ؕ (7:3) جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اس کے علاوہ سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ یہ مختلف فقہ اور شریعت جن کی اتباع کی وجہ سے مسلمانوں میں فرقہ بندی ہوئی یہ سب بنوعباس کے دور میں مدون ہوئی تھیں اور وہ حکومتیں صرف مسلم حکومتیں تھیں۔ ان میں بادشاہت کا موجود ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ملوکیت کے تابع مسلم حکومتیں تھیں۔ اسلامی حکومتیں ہرگز نہیں تھیں۔ جس طرح آج ترکی، مراکش، مصر وغیرہ کی حکومتیں ہیں، مگر اسلامی حکومتیں نہیں ہیں۔ اسی طرح بنوعباس کی حکومت مسلم حکومت تو تھی مگر اسلامی حکومت نہ تھی۔ غیر اسلامی حکومت کے قوانین اسلامی نہیں ہو سکتے اور اُس دور کی حکومت کے قوانین کی پابندی اُس دور کے لوگوں کے لئے ضروری تھی ہم اس کی اطاعت کے مکلّف نہیں ہیں۔ ہر اسلامی حکومت کے جاری کردہ قوانین اس دور کی شریعت اور فقہ ہوتے ہیں۔ ہم غلطی سے ان سابقہ قوانین کی اطاعت ضروری سمجھتے ہیں اور وہ فقہ مختلف حضرات کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس لئے ہم میں مختلف آئمہ کے اختلاف کی وجہ سے فرقہ بندی قائم ہے لیکن اگر ہم اب اسلامی حکومت

قائم کر کے اپنی ضروریات کے مطابق قرآنِ کریم کی جزئیات خود مقرر کرتے رہیں اور وہ بطورِ قانون جاری کرنے لگیں تو فرقہ بندی از خود ختم ہو جائے گی۔

مثلاً قرآنِ کریم نے روزے کے متعلق فرمایا: ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ (2:187) روزے کو رات تک پورا کرو۔ اس دور میں مختلف فقہ میں رات کو مختلف وقت سے شروع کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے روزہ کھولنے کا ایک وقت نہیں رہا اور مختلف فرقوں میں اختلاف ہے۔ اس دور کی اسلامی حکومت خود رات کا تعین کر دے کہ رات فلاں وقت سے شروع ہوتی ہے اور سب مسلمان اسی وقت روزہ کھولیں۔ اس طرح یہ اختلاف رفع ہو جائے گا۔ اسی طرح قرآنِ کریم نے چور کی سزا قطع ید بیان فرمائی ہے مگر چور اور ہاتھ کی خود تعریف نہیں فرمائی اس لئے اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ اسلامی حکومت کے لئے لازم ہے کہ وہ اس طرح اختلافی مسائل حل کر دے۔ ہمارے ہاں اختلاف جزئیات کے مختلف تعین کی وجہ سے ہوا ہے۔ جس کے سبب مختلف فقہیں وجود میں آئیں۔ صرف ان فقہ کی وجہ سے فرقہ بندی پیدا ہوئی۔ اس کا واحد حل اسلامی حکومت کا قیام ہے اور وہ حکومت خود قرآنِ کریم کے اصول واحکامات کی جزئیات مقرر کر دے، وہی اس دور کی فقہ ہوگی۔ کیونکہ ہم سابقہ کسی دور کی فقہ کی پابندی کے مکلّف نہیں۔ اس طرح فرقہ بندی ختم ہو سکتی ہے۔

> قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کا نتیجہ عذاب عظیم قرار دیا ہے اور جو عذاب اس کے نتیجے میں وارد ہوتا ہے اس کی مختلف شکلیں ہیں جو قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر بیان فرمائی ہیں۔ بھوک، پیاس، تکلیف، خوف، وحزن، خانماں خرابی سب کے لئے قرآنِ کریم میں عذاب کا لفظ آیا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان تمام سختیوں، تکلیفوں کے لئے جو فرعون کی قوم غالب نے اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر روا رکھی تھیں عذاب کا لفظ استعمال کیا ہے۔ (20:47)

قرآنِ کریم قوموں کے عروج وزوال کے اسباب بیان فرماتا ہے اور گذشتہ اقوام کے حالات بطور استشہاد پیش کرتا ہے کہ سابقہ اقوام کو ان ہی اصولوں کے مطابق عروج وزوال سے دوچار ہونا پڑا۔ عرب جن اقوام سے بخوبی واقف تھے ان میں سے ایک قوم عاد بھی تھی۔ سورۃ ہود میں قوم عاد کے جرائم ومعائب اور حضرت ہود علیہ السلام کی تعلیم کی تفصیل بیان کرنے کے بعد قرآن کریم صرف ایک آیت میں ان کی ذہنی پستی اور قلبی خباثت کو اس طرح بیان فرماتا ہے کہ: وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (11:59) یہ قوم عاد تھی جنہوں نے اپنے پروردگار کے احکام وقوانین سے انکار کیا اور اپنے رسولوں کی دعوت سے سرکشی برتی لیکن (حیرت یہ ہے) کہ اپنے ان سرکش اور ظالم حکام کی اطاعت کرتے رہے جو عمداً حق کی مخالفت کرتے تھے۔ بعینہٖ یہی حالات آج ہم مسلمانوں کے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں کے احکام کی مخالفت کرتے ہیں اور اسلامی حکومت کے قیام اور قانون الٰہی کے اجراء سے ابا کرتے ہیں لیکن جو بھی ظالم اور جابر

حکمران برسراقتدار آیا، اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کے لئے بالکل رضامند ہوتے ہیں۔ قرآنِ کریم نے انسان کی حکومت انسان پر مطلقاً حرام قرار دی ہے اور انسانوں کو قانون سازی کا کوئی اختیار نہیں دیا اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) حکومت سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو زیب نہیں دیتی۔ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18:26) اللہ تعالیٰ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ اگر مسلمان اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ قوانین (قرآن مجید) کے مطابق زندگی بسر کرنے لگیں تو قرآن کے وعدے کے مطابق وہ تمام اقوام پر غالب بھی ہوں گے اور دیگر تمام اقوام کے نگران بھی۔ مسلمانوں کا عروج وزوال ان کے دین اور نظام کے عروج زوال کے ساتھ وابستہ ہے۔ مسلمانوں پر ہر حالت میں فرض ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کے تحت زندگی بسر کریں اور اس کے علاوہ انسانوں کے خودساختہ قوانین کے تحت زندگی بسر کرنے سے مطلقاً گریز کریں۔ صدرِ اوّل میں مسلمانوں کے عروج کا راز بھی اسی میں مضمر تھا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کو متمکن کیا اور اس کے ماتحت زندگی بسر کی۔ جب سے مسلمانوں نے دین اسلام کو ترک کیا اسی دن سے ان پر زوال و اِدبار کی ابتداء ہوگئی۔ زندگی کی جتنی پریشانیاں، برائیاں، معائب واسقام ہوسکتے تھے وہ سب اُمت مسلمہ میں درآئے۔ نکبت واخلاص، غربت وجہالت، محکومی ومسکینی، تملق وخوشامد، پریشانی ودرماندگی، مسلمانوں کا شعارِ زندگی بن گئے۔ لیکن سب سے بڑی لعنت اور مصیبت جس نے مسلمانوں کو بالکل تباہ حال اور برباد کردیا وہ ان کا آپس کا افتراق وشقاق تھا اور ہے جس نے ایک ہزار سال سے فرقہ بندی کی صورت اختیار کررکھی ہے اور روز بروز اس کی گرہیں مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی ہیں، ایک فرقہ دوسرے فرقے کا دشمن اور خون کا پیاسا ہوگیا ہے اور ایک دوسرے کو قتل کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ جو قوتیں اور صلاحیتیں مسلمان دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لئے استعمال کرتے، وہ آپس میں ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لئے استعمال کررہے ہیں۔

قرآن نے فرقہ بندی کو بنصِ صریح شرک قرار دیا ہے ارشاد حضرت باری عزاسمہ ہے مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا ؕ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ ۝ (30:31-32) اللہ کی طرف رجوع رکھو اور اس سے ڈرو، صلوٰۃ کی پابندی کرو اور شرک کرنے والوں میں سے مت ہوجانا کہ انہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور بہت سے گروہ ہوگئے اور ہر ایک گروہ اپنے اس طریقے پر نازاں ہے جو اس کے پاس ہے۔

اس آیت کریمہ کی رو سے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور خود گروہ در گروہ ہوجانا شرک ہے جس سے اجتناب لازم ہے اور قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کو جو شرک قرار دیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دین میں تو آخری سند قرآن کریم ہوتا ہے، جو اللہ کی کتاب ہے۔ لیکن فرقہ بندی کے بعد ہر شخص اپنے فرقہ کا پابند ہوتا ہے اور ہر فرقہ میں آخری سند وہ ذات ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ فرقہ بنتا ہے۔ اس لئے وہ فرقہ شرک کا مرتکب ہوتا ہے اور اس کا اللہ تعالیٰ سے کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ ایک دوسری جگہ

ارشادِ عالی ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ (6:159) بیشک جنہوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں (ترجمہ: مولانا اشرف علی تھانوی) اس کی یہ وجہ ہے کہ حضور ﷺ کی تعلیمات کے مطابق تو ایک اُمت واحدہ بنتی ہے، یہ الگ فرقہ بنانے والے ایک متوازی دین کے متبع ہو گئے، اس لئے ان کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے نہیں رہتا۔ تاکید مزید کے طور پر قرآنِ کریم نے سورۃ آل عمران میں نہایت پرشکوہ الفاظ میں فرمایا: وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ۪ (3:103) تم سب مل کر قرآنِ کریم کو مضبوطی سے تھامے رہو اور فرقے میں تقسیم نہ ہو جانا۔ یہ وہ آیت کریمہ ہے جو ہمارے دین کی اساس ہے۔ اسی میں ہماری ترقی اور عروج کا راز پنہاں اور اسی سے خود دین کا استحکام بھی ممکن ہے۔ یہ حبل اللہ ہی وہ محکم سہارا ہے جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ وہ ضابطۂ حیات ہے جو کبھی دھوکا نہیں دے سکتا اور یہ کسی زمان، مکان، قوم، خطہ سے مخصوص نہیں۔ عقل کے خود ساختہ قوانین زمانے کے تقاضوں کی وجہ سے فرسودہ ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضابطۂ الٰہی ہر زمانے کا ساتھ دے سکتا ہے اور تمام حدود و قیود و امتیازات سے ماوراء اور بالاتر ہے۔ اس کے اصول وہ ابدی اور مستقل اقدار ہیں جن میں کبھی کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی۔ اسی آیت مجیدہ پر غور کرنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ آیت پرزور، موثر اور اپنے مفہوم پر بہت اصرار کرنے والی ہے۔ آیت کا ایک حصہ امر پر دوسرا حصہ نہی پر مبنی ہے تاکہ اپنے مفہوم اور حکم پر سخت تاکید کر سکے۔ قرآنِ کریم کو تھامے رہو اور فرقہ بندی نہ کرو۔ آیت سے واضح ہے کہ فرقہ بندی صرف اس صورت میں ہوتی ہے، جب حبل اللہ چھوڑ دی جائے۔ جب تک اللہ کی رسی کو تھامے رہیں گے فرقہ بندی نہیں ہو سکتی۔ فرقہ بندی کو قائم رکھتے ہوئے اپنے آپ کو ہدایت یافتہ سمجھنا محض اپنے آپ کو دھوکہ دینا ہے۔ آیت کے الفاظ اس بات کی وضاحت کر رہے ہیں کہ فرقہ بندی سے بچنے کا واحد ذریعہ قرآن کریم کو تھامے رکھنا ہے۔ اس آیت سے یہ بات بخوبی واضح اور روشن ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق قرآن سے نہیں رہتا، کیونکہ فرقہ بنتا ہی جب ہے جب قرآن کو چھوڑ دیا جائے۔

ان تینوں آیات کریمات سے واضح ہوا کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور قرآنِ کریم سے کوئی تعلق برقرار نہیں رہتا۔ قرآنِ کریم کی رو سے فرقہ بندی نہ صرف کفر و شرک ہے بلکہ اس کا نتیجہ تباہی، بربادی اور رسوا کن عذاب ہے۔ سورۃ آل عمران میں ارشاد گرامی ہے: وَلَا تَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ تَفَرَّقُوۡا وَاخۡتَلَفُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡبَیِّنٰتُ ؕ وَ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ۙ﴿۱۰۵﴾ (3:105) خبردار رہو تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت آ جانے کے بعد آپس میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کر لیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ یہاں قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کا نتیجہ عذاب عظیم قرار دیا ہے اور جو عذاب اس کے نتیجے میں وارد ہوتا ہے اس کی مختلف شکلیں ہیں جو قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر بیان فرمائی ہیں۔ بھوک، پیاس، تکلیف، خوف، وحزن، خانماں خرابی

سب کے لئے قرآنِ کریم میں عذاب کا لفظ آیا ہے۔قرآنِ کریم نے ان تمام سختیوں،تکلیفوں کے لئے جو فرعون کی قوم غالب نے اپنی محکوم قوم بنی اسرائیل پر روا رکھی تھیں عذاب کا لفظ استعمال کیا ہے۔(20:47) سورۃ البقرہ میں مُفْلِحُوْنَ کے مقابلے میں لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۚ (2:7) لاکر واضح کر دیا کہ عذاب کے ملنے سے زندگی کی خوشگواریوں سے محرومی و ناکامی، ذلت وخواری، محکومی وعاجزی، افلاس اور غربت ان تمام صفات کو قرآن کریم نے مختلف مقامات پر عذاب سے تعبیر کیا ہے۔ چونکہ فرقہ بندی کا نتیجہ عذاب عظیم ہے اس لئے یہ تمام صفات منطقی طور پر فرقہ کے نتیجہ میں حاصل ہونا لازمی ہیں اور قرآنِ کریم کی تنذیر کی صداقت ہم سب کے سامنے ہے کہ ہم میں فرقہ بندی اور تفرقہ اندازی کی وجہ سے وہ سارے معائب واسقام موجود ہیں جو قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کے نتیجہ میں لفظ عذاب کے ضمن میں شمار کرائے ہیں۔

قرآنِ کریم نے اسلام کو ملت ابراہیم کہا ہے (2:135) یعنی وہ طریقہ جسے وحی الٰہی کی رو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنایا تھا۔ دوسری جگہ فرمایا: مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا (22:78) تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر قائم رہو اس نے تمہارا لقب مسلمان رکھا ہے،، نزولِ قرآن سے پہلے بھی اور قرآن میں بھی۔اس سے عیاں ہوتا ہے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہیں۔انہوں نے ہی ہمارا نام ''مسلم'' رکھا ہے۔ جو اُن کے زمانے سے لے کر آج تک ہمارا نام ہے،اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے نام سے موسوم کرنا اور کسی تشخص سے خود کو معروف کرنا قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔اس کے علاوہ یہ تاکید بھی فرمائی کہ: فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ (2:132) پس تم نہ مرنا مگر اس حالت میں کہ تم مسلمان ہو۔ انسان کی آخری حالت موت کی ہی ہوتی ہے جس میں ہر انسان چاہتا ہے کہ ایسی حالت میں فوت ہو کہ اس کا پروردگار اس سے راضی ہو،اس آخری حالت کے لئے بھی یہ تاکید ہے کہ اس وقت بھی انسان کی سوائے مسلمان کے اور کوئی حالت نہ ہونی چاہئے۔

> اتحاد بین المسلمین کے معنی ہی یہی ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں ایک دوسرے سے اتحاد رکھیں اور باہمی تصادم سے اجتناب کریں۔لیکن اصل بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے فرقہ بندی منع ہے اور شرک ہے خواہ وہ آپس میں محبت اور مودت ہی سے کیوں نہ رہیں۔فرقہ بندی چونکہ ہم نے قبول کر رکھی ہے اس لئے اس کے اثرات، عقائد کے علاوہ تفسیر، حدیث، تاریخ سب میں ہی سرایت کئے ہوئے ہیں اور ہر فرقہ بندی نے عقائد کے اختلاف کے علاوہ تفسیر، حدیث، تاریخ کو بھی متاثر کیا۔

قرآنِ کریم نے فرقہ بندی کی اس قدر مذمت اور تنقیص کی کہ اسے شرک ٹھہرایا اور قرآنِ کریم کی رو سے فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق نہ اللہ تعالیٰ سے ہے نہ رسول اللہ ﷺ سے نہ ہی قرآنِ کریم سے باقی رہتا ہے۔اس کی وجہ سے اس دنیا میں بھی رسوائی اور آخرت میں بھی خجالت ہے۔لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں یہ فرقہ بندی ایک ہزار سال

سے چلی آ رہی ہے اور مسلمان اس کو تسلیم (Recognise) کرتے چلے آ رہے ہیں اور اس سے بڑھ کر حیرت اور استعجاب اس پر ہے کہ ہماری پیشوائیت بھی اس کو تسلیم کرتی ہے اور کبھی اس کے خلاف لب کشائی نہیں کرتی۔ بلکہ خود اپنے کو کسی نہ کسی فرقے سے مربوط رکھتی ہے۔ وہ صرف اس بات کے خلاف ہے کہ آپس میں تصادم و تزاحم نہ ہو اور ملک میں اس کی وجہ سے فساد برپا نہ ہو۔ اگر مختلف فرقے آپس میں رواداری، محبت اور تعاون سے زندگی بسر کر لیں تو ہماری پیشوائیت کو فرقہ بندی سے قطعاً کوئی تعرض نہیں ہے۔

اتحاد بین المسلمین کے معنی ہی یہی ہیں کہ مختلف فرقے آپس میں ایک دوسرے سے اتحاد رکھیں اور باہمی تصادم سے اجتناب کریں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے فرقہ بندی منع ہے اور شرک ہے خواہ وہ آپس میں محبت اور مودت ہی سے کیوں نہ رہیں۔ فرقہ بندی چونکہ ہم نے قبول کر رکھی ہے اس لئے اس کے اثرات، عقائد کے علاوہ تفسیر، حدیث، تاریخ سب میں ہی سرایت کئے ہوئے ہیں اور ہر فرقہ بندی نے عقائد کے اختلاف کے علاوہ تفسیر، حدیث، تاریخ کو بھی متاثر کیا جس کی تفصیل پیشِ خدمت ہے۔

قرآنِ کریم نے قرآن فہمی کے اصول وضوابط خود متعین فرمائے ہیں جن کے مطابق اگر قرآنِ کریم کو سمجھا جائے تو دو اور دو چار کی طرح قرآنِ کریم خود سمجھ میں آ جاتا ہے۔ منجملہ دیگر اصولوں کے قرآن فہمی کا پہلا اصول جو خود قرآن نے وضاحت سے بیان فرمایا ہے تصریفِ آیات ہے۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (6:65) دیکھئے تو سہی ہم کس طرح آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تاکہ لوگ ان کو سمجھ جائیں۔ حضور ﷺ کے متعلق بھی بیان فرمایا ان کا طریقہ بھی قرآن فہمی کا تصریف آیات ہی تھا۔ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ (6:105) (مفہوم) اے رسول ہم اسی طرح آیات کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں تاکہ آپ (تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) تاکہ لوگ کہہ اُٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا اور (تصریفِ آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تاکہ ہم عقل مندوں کے لئے اپنی آیات کی خود تبیین کر دیں۔ فلہٰذا ثابت ہوا کہ رسول اکرم ﷺ اس قرآنی حکم کے مطابق تصریف آیات ہی کے ذریعے درس قرآن دیا کرتے تھے۔ یعنی آپ کا طریقہ تفقہ بھی تصریف آیات ہی تھا۔ لیکن ہمارے ہاں تفاسیر میں اس قدر اہم طریقہ جو خود حضور اکرم ﷺ کی سنت بھی ہے بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آپ کسی بھی معروف تفسیر کو اٹھا کر دیکھ لیں، اس اصول کو کسی مفسر نے بھی پیش نگاہ نہیں رکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تصریف آیات سے کسی فرقہ کی تائید مشکل تھی۔ شان نزول کی وجہ سے مختلف فرقوں کی تائید آسانی سے مہیا ہو جاتی ہے۔ شان نزول مختلف ہونے کی وجہ سے آیات کا مفہوم ہی بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ مثلاً جو آیات مجموعی طور پر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف و توصیف میں وارد ہوئیں اور جن کا تعلق کسی بھی خاص شخصیت سے نہیں تھا شان نزول نے ان آیات کو مختلف حضرات کے متعلق قرار دے دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک فرقہ نے ان سے کسی کی تعریف مقصود لی اور دوسرے نے کسی دوسرے صاحب کی۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ہی آیت کے دو دو تین تین

شانِ نزول بیان کر دیئے گئے۔ قرآنِ کریم عالمگیر ضابطۂ حیات ہے (28:1) اس کے احکام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہیں لیکن شانِ نزول کی وجہ سے قرآنی احکام کی عمومیت کو، جو قیامت تک کے لئے پوری نوعِ انسانی کے لئے تھی صرف چند افراد کے لئے محدود کر دیا گیا ہے۔ آپ سارا قرآنِ مجید پڑھ جائیں، ہر ایک آیت کسی نہ کسی شخصیت یا کسی نہ کسی واقعہ سے متعلق کر دی گئی (مثالیں آگے آئیں گی) اور اس کی عمومیت ختم کر دی جاتی ہے۔ اس طرح شانِ نزول کا طریقہ نہ صرف قرآنِ کریم کے سمجھنے میں ایک رکاوٹ ہے بلکہ اس سے فرقہ بندی کو ہوا ملتی ہے، اور صرف فرقہ کی تقویت کے لئے ہی اس کو ایجاد کیا گیا۔

قرآن کریم میں حضور ﷺ کو کفار کے لئے طلبِ مغفرت سے منع کیا گیا ہے فرمایا: اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ ؕ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ؕ (9:80) (مفہوم) اے رسول ان منافقین کے لئے آپ مغفرت طلب کریں یا نہ کریں ہمارے لئے برابر ہے۔ اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں گے، تو پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ آیت کریمہ اتنی صاف اور واضح ہے کہ ہر شخص اس کا مفہوم بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ اس میں حضور ﷺ کو منافقین کے لئے مغفرت طلب کرنے سے منع فرمایا گیا ہے کہ حضور ﷺ اگر ان کے لئے طلب مغفرت کر بھی لیں تو بے سود ہوگا کیونکہ اللہ انہیں معاف نہیں فرمائے گا۔ اس وضاحت کے بعد اب آپ اس آیت کا شان نزول ملاحظہ فرمائیں۔

عبداللہ نافع ابنِ عمر سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی (منافق) جب فوت ہوا تو اس کا بیٹا حضور ﷺ کے پاس آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہمیں اپنا کرتا عنایت فرما دیں کہ ہم اس سے اس کا کفن بنائیں اور آپ اس پر جنازے کی نماز پڑھائیں اور اس کے لئے دعائے مغفرت کریں نبی ﷺ نے اس کو اپنا کرتہ عنایت کیا اور فرمایا کہ مجھے خبر دینا تو نماز پڑھا دوں گا۔ جب آپ نے اس کا نماز جنازہ پڑھانے کا ارادہ کیا تو حضرت عمرؓ نے آپ کو کھینچا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافق پر نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے (9:80) آپ نے فرمایا مجھے دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم ان کے لئے دعائے مغفرت کرو یا نہ کرو اگر آپ ان کے لئے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں گے، تو پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں کرے گا۔ چنانچہ آپ نے اس پر نماز پڑھی تو یہ آیت اتری وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا کا شان نزول کہ آیت کریمہ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ کے انداز بلاغت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تو یہ بات سمجھ گئے کہ حضور ﷺ کو منافقین کے لئے دعائے مغفرت کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا بلکہ ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن خود حضور ﷺ نے قرآنی انداز فصاحت و بلاغت کا الٹا مفہوم لیا۔ فرمایا کہ: اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ کے الفاظ میں آپ کو منافقوں کے لئے طلبِ مغفرت کرنے یا نہ کرنے کے دونوں اختیار عطا فرمائے گئے ہیں۔ اور اس غلط اخذ شدہ مفہوم کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے منع کرنے بلکہ مُصَلّٰی پر سے کھینچنے کے باوجود آیت نمبر (9:80) کی مخالفت کا ارتکاب کر جائیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فہم کی تصدیق اور حضور ﷺ کے فہم کی تردید کرتے ہوئے اس امر کی

وضاحت کے لئے کہ آپ نے (9:80) کا مفہوم درست نہیں سمجھا، یہ آیت کریمہ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ نازل فرمائی۔

ایک اور آیت کریمہ مع ترجمہ کے ملاحظہ فرمائیں۔ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوۡا ؕ وَاِنۡ كُنۡتُمۡ مَّرۡضٰٓى اَوۡ عَلٰى سَفَرٍ اَوۡ جَآءَ اَحَدٌ مِّنۡكُمۡ مِّنَ الۡغَآئِطِ اَوۡ لٰمَسۡتُمُ النِّسَآءَ فَلَمۡ تَجِدُوۡا مَآءً فَتَيَمَّمُوۡا صَعِيۡدًا طَيِّبًا فَامۡسَحُوۡا بِوُجُوۡهِكُمۡ وَاَيۡدِيۡكُمۡ مِّنۡهُ ؕ مَا يُرِيۡدُ اللّٰهُ لِيَجۡعَلَ عَلَيۡكُمۡ مِّنۡ حَرَجٍ (5:6) اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی جائے ضرور میں سے آئے، یا بیوی سے لمس کرے اور پانی نہ پائے، تو آلائش کو پاکیزہ مٹی کے ساتھ صاف کرلیا کرو اور منہ اور ہاتھوں سے گرد وغبار پونچھ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی کا ارادہ ہرگز نہیں رکھتا۔ آیت کریمہ بالکل صاف ہے، قرآنِ کریم ہر مسئلے کی ضروری شقیں ساتھ ساتھ بیان کرتا چلا جارہا ہے۔ کسی قسم کا کوئی ابہام اور اشکال نہیں ہے۔ معمولی سمجھ بوجھ کا آدمی اس آیت کو بخوبی سمجھ کر اس پر عمل کرسکتا ہے مگر اب اس کا شانِ نزول ملاحظہ فرمائیں۔

حضور اکرم ﷺ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ سفر میں تھے۔ قافلہ ایسے مقام پر تھا جہاں پانی موجود نہیں تھا، قافلے کو روانگی کا حکم ملا چنانچہ کوچ ہونے والا تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار گم ہوگیا۔ ہار کی تلاش میں نماز کا وقت تنگ ہوگیا۔ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو طعنے دینے شروع کردیئے کہ دیکھئے آپ کی بیٹی نے کیا کیا۔ نماز کا وقت جارہا ہے پانی ہے نہیں اور اس نے قافلے کو روک دیا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انہیں بہت سخت سست کہا، لیکن انہوں نے اس لئے کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ حضور ﷺ عائشہ رضی اللہ عنہا کے زانو پر سر رکھ کر سو رہے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا صحابۂ رسول ﷺ اور اپنے والد بزرگوار کے طعنوں کو زہر کا گھونٹ سمجھ کر پی گئیں تو اس وقت تیمم کا حکم نازل ہوا کہ پانی نہ ہو تو تیمم کرلیا کرو (ملخص بخاری شریف قرآن محل صفحہ نمبر: 770) آیت بالکل واضح ہے کسی تفسیر یا شانِ نزول کی ضرورت نہیں ہے لیکن شانِ نزول نے ناموسِ رسالت ﷺ اور عزتِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مجروح کیا۔ قافلہ میں سب صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نماز کے لئے تیار ہیں اور وقت کی قلت کی وجہ سے پریشان ہیں، مگر روایت کے مطابق حضور ﷺ سفر کے دوران بھی بالکل بے فکری کے عالم میں اپنی زوجہ محترمہ کے زانو پر سر رکھے آرام فرمارہے ہیں اور نماز کا کوئی خیال تک نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہار گم ہوجانا اتنا بڑا جرم نہیں کہ سب صحابہؓ اور حضرت ابوبکرؓ اس پر اس قدر برہم ہوں، اور حضرت عائشہؓ کا کوئی پاس کسی کو نہیں۔ تیسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کو اس کا علم نہیں تھا کہ ہم مسلمانوں پر ایسے وقت بھی آئیں گے جہاں وضو کے لئے پانی نہ ہو وہاں تیمم کرلیا کرو۔ یہ روایات وضعی معلوم ہوتی ہیں۔ اصل بات یہی ہے کہ یہ حکم وضو کے حکم کے ساتھ ہی نازل ہوا ہے۔ کیونکہ یہ آیت بالکل وضو کی آیت کے متصل وملحق ہے۔ عقلی اعتبار سے بھی شانِ نزول کا تصور درست معلوم نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کے منشاء وتدبیر کے مطابق نازل ہوا ہے۔ اگر بالفرض وہ واقعہ پیش نہ آتا تو کیا وہ آیت نازل نہ ہوتی یا اگر واقعات زیادہ پیش آجاتے یا ان سے مختلف نوعیت کے پیش آجاتے تو کیا اس سے زیادہ آیات کا نزول ممکن تھا؟

(جاری ہے)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(گذشتہ سے پیوستہ)

دوقومی نظریہ پاکستان کی اِسلامی مملکت میں اِنسانی ذات کا ارتقاء

باب نمبر:3

اللہ کا عدم سے مُضمِر وجود کی خلق کی ابتداء سے ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے ہماری دنیا کے اِنتہائی اِنسانی ذات کے مقام تک کا سفر

19۔قرآن کا سورۃ الحج کی آیت 22 میں ارتقاء کی منازل کا ذکر:

اِس باب میں ہم اللہ کے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنۡ كُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ مِّنَ الۡبَعۡثِ فَاِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ مِنۡ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنۡ مُّضۡغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَیۡرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَیِّنَ لَكُمۡ ؕ وَنُقِرُّ فِی الۡاَرۡحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ نُخۡرِجُكُمۡ طِفۡلًا ثُمَّ لِتَبۡلُغُوۡۤا اَشُدَّكُمۡ ۚ وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ یُّتَوَفّٰی وَمِنۡكُمۡ مَّنۡ یُّرَدُّ اِلٰۤی اَرۡذَلِ الۡعُمُرِ لِكَیۡلَا یَعۡلَمَ مِنۡۢ بَعۡدِ عِلۡمٍ شَیۡـًٔا ؕ وَتَرَی الۡاَرۡضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡهَا الۡمَآءَ اهۡتَزَّتۡ وَرَبَتۡ وَاَنۡۢبَتَتۡ مِنۡ كُلِّ زَوۡجٍۭ بَهِیۡجٍ ۝(22:5)

اے لوگو! اگر تمہیں مرنے کے بعد، جی اٹھنا، ناممکن دکھائی دیتا ہے، تو اس حقیقت پر غور کرو، کہ ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتداً، بے جان مٹی سے کی۔ پھر زندگی کی افزائش بذریعہ تولید، منی سے ہوئی۔ پھر جنین سے (جہاں تولید کا جرثومہء حیات ایک جونک) کی شکل اختیار کر لیتا ہے، پھر یہ جنین ایک متشکّل اور غیر متشکّل گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نطفہ ان مراحل سے اِس لئے گزرتا ہے، تاکہ اِس کی مضمر صلاحیّتیں بتدریج نشوونما پا کر ظہور میں آجائیں (23:13)۔ نطفہ ہمارے قانون مشیّت کے مطابق، ایک مقررہ وقت تک رحم مادر کے اندر رہتا ہے، پھر تم ایک جیتے جاگتے بچے کی شکل میں دنیا میں آجاتے ہو۔ پھر تم رفتہ رفتہ اپنی جوانی کی حالت تک پہنچتے ہو (16:70)۔ اور تم میں سے بعض جوانی ہی میں فوت ہو جاتے ہیں، اور بعض بوڑھے ہو کر عمر کی نکمی حالت تک پہنچتے ہو، جس میں حالت یہ ہو جاتی ہے کہ انسان سمجھ بوجھ حاصل کر لینے کے بعد، پھر سے بے سمجھی کی حالت کی طرف چلا جاتا ہے۔ (خدا کے قانون تخلیق کو سمجھنے کے لیے) تم خشک (ویران) زمین کو دیکھتے ہو۔ پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں، تو وہ لہلہانے لگتی ہے، اور اس کی روئیدگی روز بروز ابھرتی چلی جاتی ہے۔ اس طرح

زمینِ مردہ سے خوشنما مناظر کی ایک دنیا ظہور میں آجاتی ہے۔ (تو تمہارا دوبارہ جی اٹھنا کیسے ناممکن ہے)؟

قرآن میں بیان کئے گئے نظریہِ ارتقاء کے قانونِ تخلیق کے مُختلِف درجات کا مرحلہ وار ارتقاء گناتے ہوئے، قرآن یہاں پہلے انسانی طبیعی زندگی کی شکل کے مراحل کا ذکر کرتا ہے کہ:

1۔ ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتدأ، بے جان مٹی سے کی۔

2۔ پھر زندگی کی افزائش بذریعہ تولید، منی سے ہوئی۔

3۔ پھر جنین سے (جہاں تولید کا جرثومہء حیات ایک جونک) کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

4۔ پھر یہ جنین ایک متشکّل اور غیر متشکّل گوشت کے ٹکڑے میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

5۔ نطفہ ہمارے قانون مشیّت کے مطابق، ایک مقررہ وقت تک رحم مادر کے اندر رہتا ہے۔

6۔ پھر تم ایک جیتے جاگتے بچے کی شکل میں دنیا میں آجاتے ہو۔

7۔ پھر تم رفتہ رفتہ اپنی جوانی کی حالت تک پہنچتے ہو۔

8۔ اور تم میں سے بعض جوانی ہی میں فوت ہوجاتے ہیں۔

9۔ اور بعض بوڑھے ہوکر عمر کی نکمی حالت تک پہنچتے ہو، جس میں حالت یہ ہوجاتی ہے کہ انسان سمجھ بوجھ حاصل کر لینے کے بعد، پھر سے بے سمجھی کی حالت کی طرف چلا جاتا ہے۔

> زندگی کو، طبیعی قوانین کے مطابق، طبیعی زندگیوں پر مبنی سامان زیست (توانائی) کو اپنے اندر جذب کر کے اگلے مرحلہ میں جانا ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ پہلے والے سے بہتر اور بلند ہوتا ہے، جس میں مطلوبہ قوّت مدافعت ومحافظت اگلے مرحلہ (مستودع) کے موانعات کو مغلوب کرنے کے لئے پہنچائی جا سکے۔ اگلے مرحلے کے لئے مطلوبہ قوّتِ مدافعت ومحافظت بہم پہچانے کو قرآن کی زبان میں زندگی کا اپنے اعمال صالح کا پلڑا جھکانا کہتے ہیں۔

قرآن انسان کو بتاتا ہے کہ کیا تمہارے ذہن میں، یہ بات نہیں آتی کہ تم ایک مرحلے میں کوئی قابل ذکر شے نہ تھے (1:76)۔ کافی مراحل طے ہوجانے کے بعد، تم کو بے جان مٹی سے پیدا کیا۔ بظاہر تمہیں مٹی سے پیدا ہونا مشکل نظر آتا ہے، لیکن ہم نے یہ کیا۔ پھر تمہاری پیدائش تولید وتناسل کے ذریعے ہوئی، جس میں منی میں موجود ایک چھوٹا سا جرثومہ رحم مادر میں قرار پکڑ کر، نشوونما پاکر، پہلے علَقَۃٍ بنا، پھر مُضغَۃٍ بنا۔ ان تمام مراحل سے جرثومہء انسان کو اس لئے گزارا، تاکہ جرثومہ میں موجود صلاحیّتیں نشوونما پاکر نمود ہوجائیں۔ تو کیا ہمارے لئے دوبارہ جی اٹھانا مشکل ہے؟ پھر مردہ انسان کے مقابل زمین مردہ کو حیات نو عطا کرنے کی مثال دے کر بتایا یہ گیا ہے کہ ہمارا قانون مضمر چیزوں کو مشہود کر دیتا ہے۔ پہلے وہ شے مضمر ہوتی

ہے، بارش کے قطرے اس مضمر شے کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ ہمارا وہی قانون، مردہ انسان کو دوبارہ کیوں نہ اٹھا کھڑا کرے گا؟ آسمانی پانی زمین کو حیات نو عطا کرتا ہے، تو وحیٔ آسمانی کی تعلیم پر عمل درآمد کرنے والوں کو اسی دنیا میں حیات نو مل جاتی ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ اِس آیت میں قرآن اِنسان کی تولیدی ذریعہ سے طبیعی/ حیوانی زندگی کے ارتقائی مراحل گنوا رہا ہے۔ اِس ضِمن میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی نے وضاحت کی ہے کہ انسان کی طبیعی/ جسمانی زندگی جبلی داعیات، طبیعی خواہشات اور نفسانی تقاضوں کے عمل پر احساس کے تحت مشتمل ہے۔ اِن احساسات بِلاعقلی کنٹرول زندگی گزاری جائے تو وہ حیوانی زندگی کہلاتی ہے، اِس لیے جب بھی انسان عقل سے ان کو قابو پانے کے لیے قدم اٹھاتے ہوئے اسے ایک زندہ، محرک اور مستحکم بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو پھر یہی جسمانی احساس کے تقاضے اس کے ارادے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اِن کا مزاحم ہونا البتہ اِس تناظر میں دیکھا جاتا ہے کہ اِن پر عقل سے قابو پا کر ہی اِس کی حیوانی زندگی سے اِنسان کے درجہ کی ارتقائی زندگی کا حصول ممکن ہوتا ہے، ورنہ وہ حیوان ہی کے مقام پر جمار ہتا ہے۔

ارسطو اسے یہاں (ارض) پر ارتقاء کی آخری کڑی سمجھتا ہے اور اِنسانی زندگی کی موت پر کوئی شے بقا یا نہیں رہتی۔ بلکہ فنا ہوجاتی ہے۔ لہذا آغاز ہی میں اُس کے نظریہِ ارتقاء کا جائزہ لیا جارہا ہے۔

7۔ اِنسانی تخلیق میں قدیم یونانی فِلاسفر ارسطو کی نظریہ ارتقاء کی دریافت:

اِنسانی تخلیق میں نظریہ ارتقاء کی دریافت سے حکمائے یونان میں ارسطو نے وضاحت سے بتایا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے ہمیں جس چیز سے واسطہ پڑتا ہے وہ غیر مخصوص مادہ ہے۔ وہ اگرچہ مطلقاً صورت سے تہی نہیں لیکن اس میں صورت کی حد درجہ کمی ہوتی ہے۔ مادہ کی سب سے نچلی شکل بے صورت مادہ سے مشابہت رکھتی ہے۔ صورت اس میں صحیح طور پر داخل نہیں ہوتی، یعنی اس کا نصب العین یا صورت اس سے باہر خارج میں موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ ابتدائی سٹیج پر مادہ کسی صورت کے حصول کے لیے حرکت کرتا ہے۔ یہ حرکت کسی خاص صورت کی طرف ہوتی ہے، اس لیے یہ حرکت خط مستقیم میں جاری رہتی ہے۔ ہلکے اجسام اوپر کی طرف اٹھتے ہیں اور بھاری اجسام نیچے کی طرف آتے ہیں۔ ان دو عملوں کو ارسطو کشش ثقل اور صعود کا نام دیتا ہے۔

غیر عضوی (بے صورت) اور بے جان مادہ کے ارتقاء کے بعد عضوی مادہ کی دوسری سٹیج آتی ہے۔ یہاں زندگی کا ظہور ہوتا ہے۔ مادہ خود کو منظم کر لیتا ہے اور اس کی صورت خارج میں نہیں بلکہ خود عضویہ میں روح کی حیثیت سے جاری وساری ہوتی ہے۔ عضویہ کا حرکی اصول یا علّتِ فاعلی، غیر عضوی مادہ کی طرح خارج میں نہیں بلکہ خود اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔

زندگی کا اوّلین ظہور نباتات میں ہوتا ہے جن میں زندگی کی دو ابتدائی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

اوّلاً تجاذب غذا اور ثانیاً تولید

نباتات کے ارتقاء کے بعد حیوانی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ حیوانات میں علّت فاعلی کی پودوں اور درختوں سے بہتر صورت ہوتی ہے۔ مادہ حیوانی عضویہ میں خود کو مزید منظم کر کے سطح زمین سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ حیوانی روح عضویہ کے لیے صورت یعنی علت فاعلی کی حیثیت رکھتی ہے۔ چنانچہ حیوانوں میں خود حرکتی پائی جاتی ہے۔

تجاذب غذا اور تولید کی خصوصیت کے ساتھ ساتھ حیوانوں کی زندگی میں حس بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہی حیوانات، نباتات سے بلند تر مقام پر فائز ہیں۔ اس حس کو البتہ ارسطو فہم عام تک محدود رکھتا ہے۔ یہ دراصل وہ شعوری کیفیت ہے، جو حیوانوں اور انسانوں کے حواس میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے تحسّات کی وحدت قائم ہوتی ہے۔ مثلاً میں میز کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایک تحس حاصل ہوتا ہے کہ یہ سرخ ہے۔ اس کے بعد اسے ہاتھ سے چھوتا ہوں تو ایک دوسرا سا تحس حاصل ہوتا ہے کہ یہ ٹھوس ہے۔ دونوں تحسات ایک ہی شے کے بارے میں ہیں۔ میز سرخ بھی ہے اور ٹھوس بھی۔ ارسطو کہتا ہے کہ تجربہ کی وحدت اسی فہم عامہ کی وجہ سے ہے۔ اس لیے حیوانات سے کم تر مخلوق یعنی پودوں اور درختوں کو فہمِ عام کے نہ ہونے سے لذت اور الم کا بھی احساس نہیں ہوتا۔

حیوانات سے ارتقاء کے بعد انسان کی سٹیج آتی ہے۔ مادہ یہاں خود کو بہت زیادہ منظم کر لیتا ہے۔ انسانی عضویہ کی صورت یعنی انسان کی روح، حیوانی روح سے افضل ہے۔ اس میں اگرچہ نباتی اور حیوانی زندگی کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، مگر اس میں عقل بھی ودیعت کر دی گئی ہے۔ حیوانی زندگی میں تفکر نہیں پایا جاتا۔ دنیا میں صرف انسان ہی ایسی مخلوق ہے جو عقل رکھتی ہے۔ اس منفرد خصوصیت کی وجہ سے فہم عامہ سے بڑھ کر انسانی روح میں قوت متخیلہ ہے۔ اس سے مراد وہ قوت ہے جس سے ذہن اشیاء کی تصویریں بناتا ہے۔ جب کوئی شے سامنے موجود ہو تو ہم حواس کے ذریعے اس کا تجربہ کرتے ہیں۔ اور جب وہ شے سامنے سے ہٹ بھی جائے تو اس کا عکس ذہن میں موجود رہتا ہے۔ ایسے عکس یا ذہنی صورتیں بنانے کی قوت کا نام قوتِ متخیلہ ہے۔ قوتِ متخیلہ سے بلند تر حصہ یاد کی قوت بھی ہے۔ یاد اور قوتِ متخیلہ میں بنیادی فرق نہیں۔ البتہ یاد میں ذہنی تصویر کے علاوہ آگہی بھی ہوتی ہے کہ یہ کسی خاص شے کا عکس ہے۔ اس یاد کو روح انسانی میں بازیافت کی صفت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یادیں غیر ارادی طور پر ذہنی سکرین پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ لیکن یاد یعنی بازیافت وہ عمل ہے جس کے ذریعے ہم ارادی طور پر کسی مخصوص ذہنی عکس کو شعور میں لاتے ہیں۔

ان صفات کے بعد ارسطو عقل کو آگے لاتا ہے۔ جو حیوانوں اور انسان میں بنیادی طور پر امتیاز کر دیتی ہے۔ ارسطو نے عقل کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک عقل انفعال یعنی تفکّر کرنے کی وہ ذہنی استعداد ہے جس سے علم حاصل ہوتا ہے۔ تفکر سے قبل تفکر کرنے کی جو ''قابلیت بالقوہ'' ذہن میں موجود ہوتی ہے، اس کو ارسطو عقل انفعال کہتا ہے۔ دوسرے عقل فعال جو خود تفکر کا عمل ہے، جو کرہ ارض پر صرف انسان کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے وہ دوسری تمام مخلوق سے ممتاز اور متمیّز مخلوق کہلاتا

ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ارسطو کے حیوانی زندگی سے اِنسانی زندگی کے ارتقاء کا بنیادی سبب اُس کا عقلِ فعال میں تفکر کے عمل کے کردار سے ہونے کے مؤقف کی قرآن میں بھی تائید ملتی ہے کہ

لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ (7:179)

وہ سینے میں دل رکھتے ہیں، لیکن اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ آنکھیں رکھتے ہیں، لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وہ کان رکھتے ہیں، لیکن اس سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ بے خبر اور گمراہ۔

اس آیت کی روشنی سے ہمیں مزید حوالوں کی ضرورت نہیں رہتی، یہ بتانے کے لیے حکمائے مغرب کی تائید میں جو لوگ عقل وشعور سے کام نہیں لیتے وہ عاقل حیوان بمعنی انسان نہیں اور قرآن کے مطابق تو وہ حیوانوں سے بھی بدتر مخلوق ہیں۔

اِسی تناظر میں علامہ اقبال نے خطبات میں مسلمان مُفکر ابن مسکویہ کی تصنیف ''الفوز الاصغر'' سے ارتقاء کا مفروضہ نقل کر کے اُس کا مؤقف کیا ہے۔

8۔ابن مسکویہ کی تصنیف ''الفوز الاصغر'' سے زندگی کے ارتقاء کا نظریہ:

ابن مسکویہ کے نظریہ کے مطابق موجودات عالم میں زندگی کا اثر سب سے پہلے نباتات کی شکل میں ظاہر ہوا کیونکہ ان میں حرکت پائی جاتی ہے اور وہ غذا کے محتاج ہوتے ہیں اور ان ہی دو خصوصیات کی وجہ سے وہ جمادات سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ اُس کے مطابق نباتات کی زندگی پر نظر ڈالیے تو ارتقاء کے اوّلین مراحل میں نہ تو ان کی پیدائش اور نمو کے لیے بیج کی ضرورت ہوتی ہے، نہ اپنی نوع کے تسلسل کے لیے انہیں اس سے کام لینا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس مرحلے پر ہم نباتات کی زندگی اور معدنیات میں یونہی فرق کریں گے کہ یہ وہ مرحلہ ہے جس میں نباتات کو عمل فجائی سے تھوڑی بہت حرکت کی طاقت مل جاتی ہے۔ اور پھر اعلیٰ تر انواع کی صورت میں برابر بڑھتی رہتی ہے تا آنکہ اس کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ پودے شاخیں نکالتے اور بیجوں کے ذریعے اپنی نوع کا تسلسل قائم رکھتے ہیں۔ لیکن پھر حرکت کی اس قوت میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ درخت پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کے تنے ہوتے ہیں اور وہ برگ و بار لاتے ہیں۔ اب اس سے بھی آگے بڑھیے تو نباتات کے ارتقاء کا آئندہ مرحلہ وہ ہے جس میں ایسی انواع کا ظہور ہوگا جن کے لیے زیادہ بہتر زمین اور زیادہ بہتر آب و ہوا کی ضرورت ہوگی۔ انگور اور کھجور ارتقائے نباتی کی آخری منزل ہیں جس کے ڈانڈے گویا حیوانی زندگی سے جا ملتے ہیں۔ چنانچہ کھجور کے اندر تو جنسی اختلاف بھی صاف طور پر نمایاں ہو جاتا ہے کیونکہ کھجور میں جڑوں اور ریشوں کے علاوہ وہ شے بھی نشوونما پا لیتی ہے جس کا وظیفہ کچھ ویسا ہی ہوتا ہے۔ جیسے دماغ کا اور جس پر گویا اس کی سلامتی اور حفظ و بقا کا دارومدار ہے۔ یہ نباتات کی زندگی میں ارتقاء کا آخری درجہ ہے یا یوں کہیے کہ حیوانی زندگی کی تمہید ہے۔

حیوانی زندگی کا پہلا قدم زمین پیوستگی سے آزادی ہے جسے گویا شعوری حرکت کی ابتداء سے تعبیر کرنا چاہیے۔ اسے حیوانی زندگی کا آغاز کہیے۔ جس میں اوّل حس لامسہ اور بالآخر حس باصرہ کی نشوونما ہوتی ہے۔ مگر پھر جب حواس نشوونما حاصل کر لیتے ہیں تو حیوانات نقل وحرکت میں آزاد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً حشرات الارض، رینگنے والے جانور، چیونٹیاں اور شہد کی مکھیاں، چوپایوں میں گھوڑا حیوانیت کا مظہر اتم ہے اور پرندوں میں عقاب۔ آخر الامر جب بندروں کا ظہور ہوتا ہے تو حیوانیت گویا انسانیت کے دروازے پر آ کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ بندر باعتبار ارتقاء انسان سے صرف ایک ہی درجہ پیچھے ہیں۔ ارتقاء کے مزید مراحل میں کچھ اور عضویاتی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں جن کے پہلو بہ پہلو انسان کی قوتِ تمیز اور روحانیت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے، تا آنکہ وحشت کی زندگی ختم ہو جاتی ہے اور انسان تہذیب وتمدن کی دنیا میں قدم رکھ دیتا ہے۔

کوئی تین سو سال پہلے سائنس نے یہ بات بے نقاب کی کہ یہ جو بھی خارجی کائنات انسانوں سمیت ہے، یہ پہلے دن سے اِس شکل میں سامنے نہیں آ گئی تھی۔ ہر شے کا آغاز پست ترین درجے میں ہوا۔ ہر شے ہزاروں لاکھوں سال کی منزلیں طے کرتی ہوئی، موجودہ شکل میں پہنچی۔ پہلا نقطہ آغاز کیسے ہوا؟ اِس کے متعلق نہ سائنس کچھ کہہ سکی ہے، نہ کہہ سکے گی۔ اِس لئے سائنس دانوں نے یہ کہا کہ کسی نہ کسی طرح اتفاق سے یہ وجود میں آ گئی۔

جدید نظریہ ارتقاء پیش کرنے والوں میں سب سے پہلے چارلس ڈارون کا نام آتا ہے، لہٰذا ابتداً اُسی کے نظریہ کے بیان سے ہوتی ہے۔

9۔ جدید نظریہِ ارتقاء کی حقیقت میں چارلس ڈارون کا موقف:

ڈارون کے نزدیک ''ارتقاء'' کے معنی یہ ہیں کہ کل جاندار، انواع نباتات، حیوانیات اور انسان سب کے سب دراصل زندگی کی کم ترقی یافتہ شکلوں سے ترقی کر کے عالم وجود میں آتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ کائنات میں طبیعی قانون کے مطابق قدرتی انتخابات کا طریق چلا آ رہا ہے۔ اِس میں جس نوع نے اپنے اندر آگے بڑھنے کے لئے قانونِ ارتقاء کے مطابق طبیعی قوّت وصلاحیّت حاصل کر لی، وہ آگے بڑھتی چلی گئی۔ تحقیق سے پتا چلا کہ جس نوع نے اپنے اندر اگلے مرحلے میں زندہ رہنے اور اگلے مرحلے کے موانعات کو مغلوب کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی، وہ اگلے مراحل کی طرف بڑھ گئی۔ جو نوع اپنے مرحلے کے موانعات کو مغلوب کرنے کی صلاحیت تو حاصل کر لیتی، لیکن اگلے مرحلے کے موانعات کو مغلوب نہ کر سکی، وہ اُسی مرحلے کی نوع بن کر رہ گئی۔ جو انواع اپنے مرحلے کے موانعات (تخریبی قوتوں) کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت بھی حاصل نہ کر سکیں، وہ ناپید ہو جاتیں۔

اب ڈارون کی تائید میں سائنسدان بتاتے ہیں کہ ٹکراؤ سے انسان کی توانائیاں بڑھتی ہیں، ٹکراؤ نہ ہو تو توانائیوں اور صلاحیّتوں کی نمود ہی نہیں ہوتی۔ خدا نے کائنات کے ارتقاء کے لئے، متضاد عناصر میں کشمکش کا اصول مقرر کر رکھا ہے، اور یہی

قانون خود انسانی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ جو فرد یا قوم کشمکشِ حیات میں تعمیری پہلوؤں کو غالب رکھتی ہے، وہ زندہ رہتی ہے، اور آگے بھی بڑھتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس جو تعمیری پہلوؤں کو غالب نہ کر سکے، تو اس میں سے زندہ رہنے، اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی ہیں، اور آخر الامر اس پر موت (زوال) طاری ہو جاتی ہے۔

متاع کہتے ہیں مسافر کے مختصر سامان کو جو دوران سفر کام آسکے۔ لہٰذا بتا دیا کہ زمین پر تم مسافر ہو، تم نے آگے بھی جانا ہے۔ آج سائنسدان بھی بتا رہے ہیں کہ ایک دن اس کائنات نے نیست و نابود ہو جانا ہے۔ مستقر ٹھہرنے کا آخری مقام نہیں ہوتا۔ قرآن کی رو سے یہ ارضی زندگی، زندگی کا آخری مقام نہیں ہے، زمین تو ٹھہرنے کا عارضی مقام ہے، تاکہ انسان اس مرحلے میں اپنی ذات کی نشوونما کر لے۔

ڈارون یہ نہ بتا سکا، اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ پہلے مادی جرثومہ حیات، جسے قرآن نفس واحدہ کہتا ہے، اُس میں زندگی کیسے وجود پذیر ہو گئی۔ اُس کے مطابق زندگی حق/تعمیری و باطل/تخریبی کی کشمکش اور ٹکراؤ کے نتیجہ کا ثمر ہے، اِس ٹکراؤ میں حق/تعمیری غالب اور باطل/تخریبی مغلوب اور حق/تعمیری غالب ہونے سے ارتقاء کرتا ہے زندگی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ڈارون نے نظریہ ارتقاء کو حقیقتِ ارتقاء اور سببِ ارتقاء کی دو اقسام کی بنیاد رکھتے ہوئے واضع کیا ہے۔

1۔ سببِ ارتقاء

2۔ حقیقتِ ارتقاء

ہمارے تنقیدی تجزیہ میں ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے یہ دونوں حقیقتِ ارتقاء اور سببِ ارتقاء کے حصے ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم جُڑے ہوئے نہیں۔ لہذا اگر پہلا حصہ درست ہو تو ضروری نہیں کہ دوسرا حصہ بھی درست ہو۔ لہذا بہتر یہی ہوگا کہ اِن دونوں امور کو الگ الگ مُبحثِ موضوع بنایا جائے۔ لہذا اِن دونوں سببِ ارتقاء اور حقیقت ارتقاء کا بالترتیب جائزہ لے رہے ہیں۔

ڈارون کے نظریہِ ارتقاء میں سببِ ارتقاء کا مؤقف:

ڈارون کا مؤقف ہے کہ اس نظام ارتقاء میں نہ تو کسی خارجی قوت کا کوئی ہاتھ تھا اور نہ ہی زندگی کسی مقصد کے حصول کی اندرونی تڑپ و خلش سے آگے بڑھ رہی تھی۔ محض میکانکی قوانین تھے جن کے ماتحت یہ سب کچھ میکانکی طور پر ہوتا چلا گیا اور بالآخر زندگی انسانی پیکر میں سامنے آگئی۔ اب انسان بھی میکانکی قوانین کے ماتحت جی رہا ہے۔ اور انہی قوانین کے مطابق ختم ہو جائے گا کیونکہ یہ سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ ڈارون کے خیال میں اگر بعض مخلوقات کی فنا و بقا کا سلسلہ یونہی ہزاروں سال سے جاری نہ رہتا تو اس وقت روئے زمین پر تو کوئی مخلوق موجود نہ ہوتی یا پھر ہر مخلوق اتنی تعداد میں ہوتی کہ یہاں انسان

قدم نہ رکھ سکتا۔

ڈارون کا نظریہ سببِ اِرتقاء میں قدرت کی اتفاقی اور مقصد کے بغیر کاروائیاں ہیں جنہیں ڈارون کشمکش حیات، قدرتی انتخاب اور بقائے اصلح پر تنقید کی جاتی ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ ڈارون ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے کہ محض اتفاقات یا قدرت کی تخریبی کاروائیوں سے کائنات/جسمِ اِنسانی کے نظام میں حیرت انگیز موزونیت اور مطابقت کیوں کر پیدا ہو جاتی ہے۔ اِس کی وضاحت میں اتفاق کے برعکس ایک جرمن ماہر حیاتیات ڈریش نے معمل (تجربہ گاہ) کے اندر تجربات کر کے ثابت کیا ہے کہ جسم حیوانی کے اندر ایک ایسا مقصد یا مدّعا کارفرما ہوتا ہے جو اس کی شکل وصورت کو متعیّن کرتا ہے۔ ڈریش کے تجربات اس نتیجہ پر پہنچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ حیوان جسم کی ایک خاص شکل وصورت کو حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لیے ایک اندرونی میلان کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ایک مجموعہ اشیاء کی طرح نہیں بلکہ ایک ناقابلِ تقسیم کُل یا وحدت کی طرح عمل کرتا ہے جس کے اندر ایک رجحان طبیعت ایسا ہے جو اس کل یا وحدت کی ضروریات کی خبر رکھتا ہے۔

اسی طرح برگسان ارتقاء کے اُن تمام نظریات کو غلط قرار دیتا ہے جو زندگی کی تخلیقی اور مُدعائی فعلیت کی بجائے کشمکش حیات کی ضرورت اور بقائے اصلح کے تصور پر مبنی ہیں۔ ہمارے ہاں کے نامور سکالر ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا سببِ ارتقاء کو اِتفاقی عمل قرار دینے کا ابطال کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ

1۔ یہ مقصد اتفاقی نہیں ہوسکتا، جبکہ ہر ایک وجود اپنے آپ کو ٹھیک طرح جانتا ہے اور اپنی اغراض کے لیے شکل وصورت کو بدلنے پہ پوری قدرت رکھتا ہے۔

2۔ سب سے پہلا جاندار جو کیچڑ میں پیدا ہوا تھا۔ شروع ہی سے ارتقاء کے عمل میں تھا اور ارتقاء کی آئندہ غرضوں اور اُمیدوں کے عین مطابق تھا۔ اس لیے یہی مقصد تھا جس نے اس جاندار کو پیدا کیا تھا۔

3۔ اس جاندار کے وجود میں آنے سے پہلے مادی کائنات اپنے تمام ارتقائی مدارج طے کر کے ایک ایسی شکل میں موجود تھی جس کے بغیر یہ جاندار وجود میں نہیں آسکتا تھا۔ لہٰذا مادی کائنات کا ارتقاء اس جاندار کی تخلیق ہی کی ایک تیاری تھی اور اس ارتقاء کا باعث بھی یہی مقصد تھا۔

4۔ پھر چونکہ مادہ کی اوّلین صورت بھی شروع ہی سے ارتقاء کے عمل میں تھی اور بعد کے مادی ارتقاء کے لیے موزوں بھی تھی اس لیے یہی وہ مقصد تھا جس نے مادہ کو نیست سے ہست کیا تھا۔

5۔ لہٰذا یہ مقصد کوئی مادی چیز نہیں اور محض ایک مقصد ہی نہیں بلکہ ایک خود شناس شعور یا نفس ہے بلکہ ایک خلاق وقدیر شخصیت ہے جو کائنات کی اصل حقیقت ہے۔

اِنہی مقاصد کی تائید میں نظریہ ارتقاء کے ماہرین کی برسوں کی تحقیق سے یہی دریافت کیا گیا ہے کہ دنیا میں بقاءِ للاصلح

کے قانون کے نتیجہ میں تین اقسام کی انواع پائی جاتی ہیں۔

1۔ایک تو وہ جن کے پنجر تو دریافت ہوئے ہیں،لیکن وہ حوادثاتِ زمانہ کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت حاصل نہ کرنے کی وجہ سے صفحۂ ہستی سے ہی نابود ہوگئیں۔

2۔دوسرے وہ جو اپنی ہستی تو برقرار رکھ سکیں لیکن مسابقت کی صلاحیت سے محروم ہونے کی بِنا پر مزید ارتقاء نہ حاصل کرسکیں۔

3۔تیسرے وہ جو زمانہ کے حوادثاتِ کا مردانہ وار مسابقت کی تقویت کے حصول کے بعد مزید ارتقاء کررہی ہیں۔

ڈارون کے نظریہِ ارتقاء میں حقیقت اِرتقاء کا موٴقف:

ڈارون حقیقت ارتقاء کو چار قوانین میں پیش کیا ہے کہ جس میں

1۔پہلے قانون انتخاب طبیعی کا مطلب یہ ہے کہ فطرت وطبیعت موجودات میں سے ان اشیاء کو منتخب کرے جن میں ''بقاء'' کی صلاحیت ہو۔

2۔دوسرے قانونِ تنازع للبقاء ایسی کشمکش اور تنازع کا نام ہے جو افراد یا انواع کے درمیان اپنی بقاء اور حیات کے لیے نظر آتا ہے۔

3۔تیسرے قانونِ بقاء الاصلح میں تنازع کی صورت میں کشمکش کے بعد جو شے باقی رہ جائے اس کا موجودات میں اصلح اور بہتر ہونا اور اس طرح اس عالم میں باقی رہنا ''بقاء اصلح'' ہے۔

4۔چوتھے قانون وراثت کا مطلب یہ ہے کہ جو فطری اور طبیعی صفات آباء واجداد (اصول) میں پائی جاتی ہیں وہی ان کی اولاد (نسل) میں منتقل ہوجاتی ہیں۔

حکمائے جدید میں ڈارون نے اپنا نظریہ ارتقاء پیش کیا کہ زندگی نے اپنی ابتدائی نمود، نہایت پست سطح سے مختلف انواع کے ذریعہ کی، جس کے بعد ان تمام انواع میں ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ارتقاء خالصتاً میکانکی (طبیعی) قوانین کی رو سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ ان قوانین میں طبیعی انتخاب، ماحول کے ساتھ مطابقت اور بقاء للاصلح نمایاں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ہر نوع آہستہ آہستہ بتدریج، ارتقائی مراحل طے کرتی گئی۔ جس نوع میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ تھی وہ فنا ہوگئی۔ جس میں یہ صلاحیت تھی وہ خارجی موانع پر قابو پاتی اور اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بناتی آگے بڑھتی گئی اور یوں زندگی کے یہ ابتدائی ذرات آہستہ آہستہ آفتاب بنتے گئے۔

ڈارون کے نظریہِ ارتقاء کی تعارف میں بتائے گئے اسبابِ حقیقتِ ارتقاء دنیا کے علمی مسلمات میں شمار ہوتے ہیں اور آج حکماء میں سے شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جو اس سے اتفاق نہ رکھتا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈارون کے زمانے سے لے کر اب تک اس کے خلاف ایک بات بھی معلوم نہیں ہوسکی بلکہ اس کے برعکس اِس کے حق میں دی گئی سبھی دلیلیں اور شہادتیں مستند

ہیں۔آج بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہر چیز میں ارتقاء ہو رہا ہے۔کوئی چیز یکا یک وجود میں نہیں آتی اور ہر چیز بتدریج پیدا ہوتی ہے۔ڈارون کے اس نظریہِ حقیقتِ ارتقاء کے اسباب میں کوئی نئی بات پیش نہیں کی بلکہ لوگوں کے مشاہدہ کے نتائج کو مزید تائید سے لوگوں کی توجہ کو زیادہ شدت کے ساتھ حقیقتِ ارتقاء کے عقیدہ کی طرف مبذول کر دیا ہے۔

ڈارون کے اس نظریہ کا البتہ ایک اثر یہ ہوا کہ اب حکماء عام طور پر سمجھنے لگے ہیں کہ ارتقاء فقط انواع حیوانات کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ حیوانات کے وجود میں آنے سے پہلے کی مادی کائنات سے بھی ہے۔ اس طرح سے کائنات کے ارتقاء کے تین مرحلے گنوائے جاتے ہیں۔

1۔کائنات کی ابتدا کی حالت سے لے کر اس جمادات ونباتات کی حالت تک جب وہ اس قابل ہوں کہ اس میں زندگی کا ظہور ہو سکے۔

2۔پھر جمادات ونباتات سے لے کر از خود حرکت کے حامل زندہ حیوان کے ظہور اور طبیعی نسلِ انسانی کے ظہور تک۔

3۔اور پھر طبیعی انسان کے ظہور سے لے کر انسان کی نفسیاتی تکمیل تک ذات کا مرحلہ جو اِس وقت تک بھی جاری ہے۔

ابھی عالمِ امر کے نظریاتی طور پر نظریہ ارتقاء کا قانون کے متعین کرنے کی عمومی حقیقت بیان کی گئی ہے۔اِس نظریاتی عمومی قانون کے اِنسانی زندگی کی تخلیق پر عملی اِطلاق کی صورت میں دیکھتے ہیں کہ قرآن بھی اِس نظریہ ارتقاء کی فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ کی منازل طے کرتے دکھائی دے رہی ہے۔

14۔اللہ کے نظریہِ ارتقاء میں کائنات کی ایک کڑی سے دوسری کڑی میں سونپے جانے کا اصول:

حیاتِ انسانی کے ارتقائی مراحل کے ایک کڑی سے دوسری کڑی میں سونپے جانے کے مراحل کی وضاحت میں سورۃ الانعام میں یوں کی گئی ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ۝۹۸

(6:98)

خدا وہی ہے،جس نے تم کو نفس واحدہ (اوّلین جرثومہء حیات) سے پیدا کیا۔پھر ہر زندگی کے لئے ایک مستقر (عارضی ٹھہرنے کی جگہ) ٹھہرائی،اور پھر اگلے مرحلے میں سونپے جانے کے لئے ایک مستودع ٹھہرایا۔ہم نے اپنے قوانین کو نکھار کر بیان کر دیا ہے،اُن کے لئے جو سمجھ اور سوچ سے کام لیتے ہیں۔

قرآن دو الفاظ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ کی اصطلاحات میں ارتقاء کی تمام کڑیاں بیان کر گیا۔مستقر کے معنی ہیں'' کسی متحرک شے کا چلتے چلتے کسی نقطہ پر آ کر رک جانا''۔مستقر سے ہی قرار لفظ ہے۔اور قرار کہتے ہی اس چیز کو ہیں کہ جس میں پہلے حرکت ہو اور پھر وہ رک جائے۔جس میں حرکت نہ ہو اس کے لئے یہ لفظ آتا ہی نہیں ہے۔متحرک شے دراصل ایک منزل میں

سونپے جانے والی منزل مستدوع کی امانت ہوتی ہے۔ جب شے کو اگلی منزل کو سونپ دیا جائے، تو اس سونپے جانے کو شے کا مستودع کہتے ہیں۔

نظریہء ارتقاء کی بنیاد، اس حقیقت پر ہے کہ زندگی جامد شے نہیں ہے، متحرک ہے اور یہ کہ زندگی کا ارتقائی سفر صعودی ہوتا ہے یعنی جس طرح ہوائی جہاز زمین سے مطلوبہ بلندی پر پہنچنے کے لئے پرواز کرتا ہے۔ زندگی اپنے اوّلین جرثومہء حیات، قرآن کی زبان میں نفس واحدہ سے حرکت کرتی ہوئی، آگے بڑھی ہے۔ لیکن اس نے مسلسل حرکت نہیں کی۔ یہ ایک منزل میں آ کر، ایک وقت کے لئے نتیجہ خیزی کے لئے رکتی رہی ہے۔ یہ رکنے والا مقام طبیعی زندگی کا مستقر کہلاتا ہے۔ ٹھہرنے سے قبل، از خود جاری وساری طبیعی قوانین کے مطابق ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ زندگی کو، طبیعی قوانین کے مطابق، طبیعی زندگیوں پر مبنی سامان زیست (توانائی) کو اپنے اندر جذب کر کے اگلے مرحلہ میں جانا ہوتا ہے۔ یہ مرحلہ پہلے والے سے بہتر اور بلند ہوتا ہے، جس میں مطلوبہ قوّت مدافعت ومحافظت اگلے مرحلہ (مستودع) کے موانعات کو مغلوب کرنے کے لئے پہنچائی جا سکے۔ اگلے مرحلے کے لئے مطلوبہ قوّتِ مدافعت ومحافظت بہم پہچانے کو قرآن کی زبان میں زندگی کا اپنے اعمال صالح کا پلڑا جھکانا کہتے ہیں۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا (6:119)

جس کے (اعمالِ صالح) کے وزن کا پلڑہ بھاری ہوگا، اُس کی زندگی اُس کی حسین آرزوں کے مطابق خوش آئند ہوگی اور جس کا ہلکا ہوگا، وہ ذِلت کی پستیوں میں گر جائے گا۔

خدا کا قانونِ طبیعی انتخاب اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ شے نے مطلوبہ مقدار میں قوّت مدافعت ومحافظت یا اپنے اعمال صالح کا پلڑا جھکا لیا ہے جو اگلی منزل کی موانعات کو ہٹانے کے کام آ سکے۔ ایسی صورت میں موجودہ منزل یا مستقر اس شے کو اگلی مگر بہتر اور بلند منزل مستدوع کے سپرد کر دیتا ہے۔ یہ مستودع پھر سے ایک خاص وقت کے لئے اس زندگی کا مستقر بن جاتا ہے اور اس مستقر میں زندگی اگلے مرحلے میں جانے کی تیاری کرتی ہے۔ پھر اپنے مستقر میں شے کو دوبارہ طبیعی سامان وزیست استعمال کر کے اگلے مستودع کے لئے مطلوبہ قوّت مدافعت ومحافظت حاصل کرنا ہوتی ہے۔ یہاں بھی خدا کا قانون طبیعی انتخاب فیصلہ کرتا ہے کہ شے کو اگلے مرحلے میں سونپا جائے یا مطلوبہ قوّت بہم نہ پہنچانے کی وجہ سے اس کو اسی مستقر کی منزل میں روک لیا جائے۔ ایسی رُک جانے والی زندگیاں اپنے اپنے جہنّم میں ہوتی ہیں۔ جہنم/جیم کے معنی ہی ایک جگہ رُک جانا اور آگے نہ بڑھنا ہے۔

محققین کے مطابق سب سے پہلے ایک جرثومہء حیات پیدا ہوا، جسے قرآن ''نفس واحدہ'' کہتا ہے۔ اُس نفس واحدہ میں الگ الگ نر و مادہ بننے کی دونوں خصوصیات تھیں۔ نظریہء ارتقاء کی رو سے کائنات میں پائی جانے والی زندگیوں کے پیکر،

ارتقائی منازل طے کرتے کرتے ،موجودہ پیکروں تک پہنچے۔سائنس بتا نہیں سکی کہ زندگی کا پہلا جرثومہء حیات کس طرح وجود میں آیا۔زندگی کا پہلا جرثومہء حیات، طاقت ورخوردبین کے سوانظر نہیں آسکتا تھا۔یہاں سے زندگی ارتقائی منازل طے کرتی کیڑے مکوڑے، رینگنے والے، دو پاؤں پہ چلنے والے، چار پاؤں پہ چلنے والے، یہ گوریلا قسم کے چمپنزی وغیرہ بنے اور آخر میں انسان اپنی موجودہ شکل و شباہت میں آیا۔نظریہء ارتقاء کی رو سے، زندگیاں ایک مرحلے میں ٹھہر کر، زمین کی طبیعی معدنیات ونمکیات کو بذریعہ پانی اپنے اندر جذب کرتی رہیں۔جتنے عرصہ زندگی کی شاخ،اس مرحلے میں ٹھہرتی، وہ اپنے اندر، مرحلے کی مطلوبہ قوّت مدافعت ومحافظت سے زیادہ اپنے اندر پیدا کرلیتی۔جس مرحلے میں زندگی زمین کے معدنیات و نمکیات اپنے اندر جذب کرتی، وہ زندگی کی شاخوں کا مستقر کہلاتا۔اگر زندگی اگلے مرحلہ کے موانعات اور رکاوٹوں کو مغلوب کرنے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کرلیتی تو وہ قانون ارتقاء کی رو سے اگلے مرحلے میں چلی جاتی یا سونپ دی جاتیں۔اگلے مرحلے میں ترقی پانے والی زندگیاں، جب دوسرے مرحلے میں داخل ہوتیں تو وہ ان کا مستودع بن جاتا۔زندگی کا پہلا مستقر تو وہ تھا جہاں سے زندگیاں ترقی پا کر اگلے مرحلے میں آئی ہیں، اور مستودع وہ ہے جہاں یہ آئی ہیں۔یوں زندگیاں اپنے مستقر سے مستودع میں آتی رہیں۔مستودع، مستقر بنتا رہا۔قرآن کہتا ہے

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (7:24)

''اب تم نے یہاں ایک خاص مدّت تک زمین پہ رہنا ہے، اور یہاں کے متاع سے فائدہ اٹھانا ہے''۔

متاع کہتے ہیں مسافر کے مختصر سامان کو جو دوران سفر کام آسکے۔لہٰذا بتا دیا کہ زمین پر تم مسافر ہو، تم نے آگے بھی جانا ہے۔آج سائنسدان بھی بتا رہے ہیں کہ ایک دن اس کائنات نے نیست و نابود ہو جانا ہے۔مستقر ٹھہرنے کا آخری مقام نہیں ہوتا۔قرآن کی رو سے یہ ارضی زندگی، زندگی کا آخری مقام نہیں ہے، زمین تو ٹھہرنے کا عارضی مقام ہے، تاکہ انسان اس مرحلے میں اپنی ذات کی نشوونما کرلے۔قرآن دو الفاظ مُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ کی اصطلاحات میں ارتقاء کی تمام کڑیاں بیان کر گیا۔اِسی سلسلہ میں قرآن مشیتِ اِلٰہی کا محو وثبات کا بنیادی قانون بھی ہمارے سامنے لاتا ہے۔اگر زندگی نے مزید آگے بڑھنے کے لئے اپنے اندر وہ طبیعی قوت مدافعت ومحافظت مہیا نہیں کی ہے، جو اگلے مرحلہ یعنی مستودع کے موانعات کو مغلوب کر سکے، تو وہ زندگی اپنے ہی مستقر کی نوع بن کر رہ جاتی ہے۔اگر زندگی نے اگلے مرحلے یعنی مستوع میں جانے اور آگے بڑھنے کے لئے طبیعی قوت مدافعت ومحافظت اگلے مرحلہ کے موانعات کو مغلوب کرنے کی حاصل کرلی ہے، تو زندگی اگلے مرحلے یعنی مستودع کے سپرد ہو جاتی ہے۔

ہم نے دیکھا کہ ڈارون کی تحقیقات کا رخ میکانکی اصولوں کی طرف جا رہا تھا۔لیکن دورِ حاضر کی تحقیقات میں پروفیسر مارگن کے نظریہ فجائی ارتقاء کے انکشاف نے ارتقائی سائنس میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔اب ہم اُس کے مؤقف کی وضاحت کریں گے۔

آصف جلیل

یومِ مئی

بہت سے ممالک میں یوم مئی کو موسم بہار کی آمد کے تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ 1889ء میں دنیا کی سوشلسٹ پارٹیوں کی کانگریس کا اجتماع پیرس میں ہوا جس میں امریکا کے مزدوروں کی اس تحریک کی حمایت کی گئی جو آٹھ گھنٹے کام لینے سے متعلق تھی۔ اس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ یکم مئی 1890ء کو امریکا کے مزدوروں کے حق میں مظاہرہ کیا جائے۔ بعد میں اسے مزدوروں کے دن کے طور پر منایا جانے لگا۔

> نوع انسانی کو محکومی کے شکنجے میں جکڑنے والی طاقتیں تین ہیں۔ سب سے پہلی ہے سیاسی' چاہے یہ بادشاہت ہو' ڈکٹیٹرشپ یا جمہوریت۔ یہ سب کبھی بزور طاقت یا کبھی عوام کو ورغلا کر ان پر حکومت کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بادشاہت یا ڈکٹیٹرشپ میں ایک فرد یا خاندان حکومت کرتا ہے اور جمہوریت میں ایک گروہ۔ یہ عوام کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے انہیں آپس میں لڑانے میں مصروف رکھتے ہیں اور خود ملکی دولت لوٹنے میں مگن رہتے ہیں۔

مزدوروں کے مسائل کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ یہ ایک نہایت وسیع موضوع ہے۔ اس مضمون میں صرف ان اسباب کا جائزہ لیا گیا ہے جو محنت کشوں کے استحصال کا باعث بنتے ہیں۔ ویسے تو محنت کش کا استحصال اسی دن سے شروع ہو گیا تھا جب اس نے ایک شاطر یا ظالم شخص کے لئے محنت کی۔ اس شاطر نے محنت کش کی محنت سے حاصل ہونے والی رقم میں سے کچھ اسے دے کر باقی اپنے پاس رکھ لی۔ اس کے بعد ایک انسان کا دوسرے انسانوں کو محکوم بنانے کا جو عمل شروع ہوا ہے وہ آج تک ختم نہیں ہو سکا۔ (سوائے اس دور کے جس میں اللہ کا نظام نافذ العمل رہا)۔ دور اول کا وحشی انسان ہو یا مہذب دنیا کا سرمایہ دار' ہر دور میں نت نئے طریقے ایجاد ہوتے رہے جن کے ذریعے انسانوں کو محکوم بنا کر ان کی محنت کا ماحصل ان لوگوں کی جیبوں میں جاتا رہا جو خود محنت نہیں کرتے۔ علم سے محروم کسی محنت کش کے ذہن میں کبھی بھی یہ خیال نہیں آتا

کہ اس کی محنت کا پھل کھانے والوں میں کس کس کا حصہ ہے۔ وہ اپنے سیٹھ، وڈیرے یا مل مالک سے معاوضہ بڑھانے یا کچھ سہولتیں مہیا کرنے کا مطالبہ کرتا ہے لیکن اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا کہ جس سے وہ اپنے لئے چند سکوں کی بھیک مانگ رہا ہے وہ اسی کی محنت کا ثمر لوٹ کر کھا رہا ہے۔

نوع انسانی کو محکومی کے شکنجے میں جکڑنے والی طاقتیں تین ہیں۔ سب سے پہلی ہے سیاسی، چاہے یہ بادشاہت ہو، ڈکٹیٹرشپ یا جمہوریت۔ یہ سب کبھی بزور طاقت یا کبھی عوام کو ورغلا کر ان پر حکومت کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بادشاہت یا ڈکٹیٹرشپ میں ایک فرد یا خاندان حکومت کرتا ہے اور جمہوریت میں ایک گروہ۔ یہ عوام کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے انہیں آپس میں لڑانے میں مصروف رکھتے ہیں اور خود ملکی دولت لوٹنے میں مگن رہتے ہیں۔ پاکستان کے عوام مسلسل ان سے دھوکہ کھا رہے ہیں جو اپنا پیٹ بھر کر بھوکوں سے ہمدردی کرتے ہیں، اپنی جاگیروں کو وسعت دینے والے کسانوں کے لئے آنسو بہاتے نظر آتے ہیں یا جدہ، دوبئی اور لندن میں عیش کرتے ہوئے عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ ان کے دکھوں میں برابر کے شریک ہیں، حالانکہ عوام کے مصائب کا سبب یہ لوگ خود ہیں۔

دوسری طاقت سرمایہ دار کی ہے جو مزدوروں کی محنت سے دولت جمع کرتا ہے اور ان کو چند سکوں پر ٹرخا دیتا ہے۔ یہ دوسروں کی محنت پر نہ صرف پھلتے پھولتے ہیں بلکہ دولت کے انبار لگاتے ہیں۔ یہ نہ تو محنت کشوں کو بھوکا رکھتے ہیں کہ کہیں وہ خونی انقلاب نہ لے آئیں اور نہ ہی انہیں پیٹ بھر کر کھانے کو دیتے ہیں۔ ایسی ذہنیت کے حامل لوگوں کی عکاسی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہیں تباہی کی نوید سنائی ہے۔ ارشاد باری ہے:

(1)

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝١ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝٢ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝٣

عام طور پر اس کے ترجمے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ترازو میں ڈنڈی مارنے والوں کے بارے میں ہے جو خود لیتے وقت تو پورا وزن کرتے ہیں لیکن دوسروں کو دیتے وقت کم تولتے ہیں۔ درحقیقت یہ آیات ایک سرمایہ دار کا طریقہ واردات بیان کر رہی ہیں کہ وہ معاوضہ دینے میں ڈنڈی مارتے ہیں، لوگوں کی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتے اور ہمیشہ ان سے اپنے مفاد کے مطابق کام لیتے ہیں۔ یہ اقلیت معاشرے کی میزان میں اپنے پلڑے کو ہمیشہ جھکائے رکھتی ہے اور عوام کی اکثریت عدم توازن کا شکار رہتی ہے۔

تیسری طاقت کی طرف تو لوگوں کی توجہ شاید جاتی ہی نہیں۔ پہلی دو طاقتوں کا آپس میں گٹھ جوڑ تو نظر آتا ہے لیکن عام طور پر نہ اس طبقے کو نہ تو طاقت سمجھا جاتا ہے اور نہ ہی اس کا دوسری دونوں طاقتوں سے کوئی تعلق نظر آتا ہے۔ یہ طاقت مذہبی رہنماؤں کی ہے جو ایک ایسے دشمن کی طرح ہیں جو دوست کے روپ میں ہو۔ لوگ ان کے ہاتھ چوم رہے

ہوتے ہیں لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کی محرومیت میں ان حضرات کا بھی حصہ ہے۔ ان کی کامیابی کا راز ان کے تقدس میں ہے۔ اگر آپ بات کی تہہ تک پہنچنا چاہتے ہیں تو چند لمحوں کے لئے تقدس کا پردہ ہٹا کر غور کریں کہ ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟ ان کے پاس دولت کہاں سے آتی ہے؟ ان کا طرز زندگی امیرانہ کیوں ہے؟

دوسری دونوں طاقتوں سے ان کا تعلق اس طرح بنتا ہے کہ یہ انہیں عوام کے غیض وغضب سے بچائے رکھتے ہیں۔ یہ عوام کے ذہنوں میں ایسے عقائد بھر دیتے ہیں کہ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ انہیں کون کون لوٹ رہا ہے اور اس کا طریقہ کار کیا ہے۔ مذہبی پیشوا تھکن سے چُور مزدور اور سورج کی تپش میں جلنے والے دہقان کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ ان کی مشکلات کا اصل سبب سیاسی رہنما' سرمایہ دار اور یہ حضرات خود ہیں۔ وہ انہیں تقدیر کی لوری دے کر سلاتے رہتے ہیں۔ لیکن علامہ اقبالؒ تو ایک راز کی بات بتا رہے ہیں:

میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا
میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں

یہ تو ابلیس کی آواز ہے اور تقدیر کا سبق بھی اسی نے سکھایا ہے۔ لہٰذا جو بھی لکھی ہوئی تقدیر کا فلسفہ سمجھا رہا ہو وہ ابلیس کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اب ذرا ان آوازوں کو بھی سنئے۔ ''اللہ جسے چاہتا ہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے''۔ ''غربت اور امارت تقدیر میں لکھ دی جاتی ہے''۔ یہ ان آوازوں کا اثر ہے کہ جب سارے دن کی مشقت سے ایک کسان کی ہڈیاں چٹخ رہی ہوتی ہیں تو وہ کہہ کیا رہا ہوتا ہے۔ ''یا اللہ تو نے میری قسمت میں کیا لکھ دیا ہے؟''۔ یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ وہ اپنے مصائب ومشکلات کے لئے اللہ تعالیٰ کو ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس کا خون نچوڑتے ہیں انہیں برا نہیں کہتا بلکہ اگر ان کی طرف سے بچے کھچے ٹکڑے بھی مل جائیں تو وہ ان کا شکر گزار ہوتا ہے۔ یہ ٹکڑے اس کی تقدیر میں اللہ تعالیٰ نے نہیں بلکہ زمیندار نے لکھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو رزق کریم کا وعدہ کرتا ہے۔ لہٰذا جب تک یہ ابلیسی تصور تقدیر محنت کشوں کے ذہنوں سے نہیں نکلے گا انہیں اللہ کا نظام سمجھ میں نہیں آئے گا۔ پہلے انہیں ''لا'' کہنا ہوگا ہر اس تصور کو جو غیر قرآنی ہے اور پھر 'الا اللہ' کی طرف بھی آنا ہوگا۔

(2)

اللہ تعالیٰ کا نظام جاننا چاہتے ہیں تو براہ راست قرآن کریم سے معلوم کریں۔ سنت نبوی ﷺ معلوم کرنی ہو تب بھی قرآن کریم ہی میں تلاش کریں۔ یہ ضروری نہیں کہ منبروں سے آنے والی صدائیں قرآن کریم کی آواز ہوں۔ جن طاقتوں کا ذکر پہلے آیا ہے ان کے بارے میں قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے۔ وہ فرعون' قارون اور ہامان کے نمائندہ ہیں۔ جب تک عوام ان تینوں کے چنگل سے نہیں نکلیں گے ان کا مستقبل کبھی روشن نہیں ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے رزق کے تمام وسائل پیدا کئے ہیں۔ سورج' ہوا' پانی اور زمین اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کی منفعت کے لئے پیدا کئے ہیں۔ ان میں سے دو پر تو

انسانوں نے قبضہ کرلیا ہوا ہے' باقی دوا بھی ان کی دسترس میں نہیں آئے۔ زمین پر پہلی مرتبہ جو قبضہ کیا گیا وہ طاقت کے زور پر تھا۔ وہ زمین جو اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کے لئے پیدا کی تھی اس پر چند لوگ قابض ہو گئے اور بعد میں اس قبضے کو انسانی شریعت نے سند عطا کر دی۔ پانی کی قلت کا مسئلہ پیدا ہوا تو طاقتور زمینداروں نے اپنی مقبوضہ زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے پانی کا رخ بھی موڑ لیا۔ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ اس کے پیدا کردہ ذرائع رزق پر قابض ہو جائے۔ اس نے کہا ہے کہ "الأَرْضُ لِلّٰہِ" (زمین اللہ کی ہے) یعنی یہ کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ اس حقیقت کو اپنی نظم کا عنوان بناتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کس خوبصورتی سے واضح کیا ہے:

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟
کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھّم سے بادِ سازگار؟
خاک یہ کس کی ہے؟ کس کا ہے یہ نورِ آفتاب
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟
دہِ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں تیری نہیں تیری نہیں

انسان صرف محنت کرتا ہے باقی سب کچھ اللہ کا نظام کرتا ہے۔ جب فصل پک کر تیار ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس کا حق ادا کر دو (6:142) یہ حق وہ اپنے بندوں کے لئے مانگتا ہے۔ خود تو وہ بے نیاز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سامان رزق پر تمام انسانوں کا حق ہے اسے اس طرح تقسیم کرو کہ کوئی اس سے محروم نہ رہ جائے۔ اس طرح وہ ہر انسان کو رزق کریم عطا کرتا ہے جس سے کوئی انسان ذلت محسوس نہ کرے۔ اگر آج کوئی بے حد امیر ہے اور کوئی بے حد غریب تو یہ محض اس لئے ہے کہ دولت کی تقسیم کے لئے اللہ تعالیٰ کا بتایا ہوا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا بلکہ ذرائع پیداوار پر قابض لوگ اسے اپنی خواہش کے مطابق استعمال میں لا رہے ہیں۔ غربت اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہے بلکہ ان لوگوں کی طرف سے ہے جو دوسروں کو محروم رکھ کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ جب تک اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق رزق تقسیم نہیں ہوگا یہ ناہمواریاں برقرار رہیں گی' ایک دوسرے کا استحصال جاری رہے گا' لوٹ کھسوٹ جاری رہے گی' یہ طاغوتی نظام پھلتا پھولتا رہے گا اور منبروں سے اسے اللہ کا لکھا کہہ کر پیش کیا جاتا رہے گا۔ اس طرح محنت کشوں کے حالات نہیں بدلیں گے۔

بہتری کا عمل نظریات کی تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر محنت کش اپنے حالات بہتر اور مستقبل خوش آئند بنانا چاہتے ہیں تو انہیں اپنے دشمنوں کی پہچان کرنا ہوگی اور ان کے فریب سے نکلنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے تجویز کردہ نظام زندگی کو اپناتے ہوئے اسے دوسروں تک پہنچائیں تا کہ ایک کارواں بن جائے جو وقت کے ساتھ ساتھ سیل رواں بن جائے جو ہر فرعون' قارون اور ہامان کو غرق کر دے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بچوں کا صفحہ

تم بہت بہادر ہو

ارشد صاحب ایک سکول میں پڑھاتے تھے۔ وہ سچ مچ ایک استاد تھے۔ بہت سے پڑھانے والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ بس کلاس میں سبق دے دیا اور پھر لڑکوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ارشد صاحب ایسے نہ تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اچھی طرح سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ ظفر کو تقریر کرنے کا شوق تھا، ارشد صاحب نے اس کی ہمت بڑھائی اور اسے بتایا کہ تقریر کیسے کی جاتی ہے۔ مزمل کو تصویریں بنانے سے دلچسپی تھی، ارشد صاحب اس کے لیے تصویریں بنانے کی کئی کتابیں لائے۔ سلیم کو شعر یاد کرنے کا شوق تھا، ارشد صاحب نے ایک کاپی پر اسے بہت اچھے اچھے شعر لکھ کر دیے۔ ایسے شعر جن سے آدمی کو اچھے اچھے سبق حاصل ہوں۔

تم تو جانتے ہی ہو کہ ہر سکول میں اچھے لڑکے بھی ہوتے ہیں اور بُرے لڑکے بھی۔ بہت سے استاد بُرے لڑکوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی بُرائی کرتے تھے۔ مگر ارشد صاحب ایسے لڑکوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ وہ کسی سے نفرت کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ اپنے ساتھیوں سے وہ اکثر کہتے تھے کہ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ بُروں کو اچھا بنایا جائے۔ یہ کام بڑی محنت چاہتا ہے اور مدتوں بعد اس محنت کا پھل ملتا ہے۔

چھٹی جماعت میں ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام فیروز تھا۔ وہ ہمیشہ سب سے بدتمیزی کرتا۔ نرمی سے بات کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ ایک دن اپنی کلاس کے کسی لڑکے سے سڑک پر اس کی لڑائی ہوگئی۔ فیروز کہنے لگا:

''تم احمق ہو۔ جاہل ہو۔ تمہارے گھر والے بھی ایسے ہی ہیں۔''

اتفاق سے یہ باتیں ارشد صاحب نے بھی سن لیں۔ دوسرے دن جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھانے آئے تو سبق شروع کرنے سے پہلے انہوں نے لڑکوں سے کہا:

''کل تمہارے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو جاہل اور احمق کہا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی بُرا بھلا کہا۔ تم سب ایک دوسرے کے بھائی ہو اگر تم دوسروں کی بے عزتی کرتے ہو تو اپنی ہی بے عزتی کرتے ہو۔''

''تعلیم اور شرافت کی ایک پہچان آدمی کی بات چیت ہوتی ہے۔ ادھر تم نے زبان کھولی اور ادھر پتہ چل گیا کہ تم کیسے انسان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن شریف میں ہمیں حکم دیا ہے کہ ہمیشہ ایسی زبان بولو جو شریفوں کی زبان مانی جاتی ہو۔''

''قرآن شریف نے ہمیں گفتگو اور بول چال کے بارے میں اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں۔ ہمیشہ صاف، سچی اور سیدھی بات کرو، جھوٹی باتوں سے ہمیشہ بچو۔ ہمیشہ اچھی اچھی باتیں کرو۔ جب بھی بات کرو انصاف کی بات کرو۔''

اور ہاں! بعض بچے اونچی آواز میں چیخ چیخ کر، چلا چلا کر باتیں کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو آج پوری دنیا میں کہیں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ گنوار اور جاہل لوگ چیخ کر باتیں کرتے ہیں۔ بہت پہلے قرآن شریف نے انسانوں کو بتایا تھا کہ اپنی آواز کو نیچا رکھو۔ سب سے بُری آواز گدھے کی ہوتی ہے۔''

''اچھا میرے بیٹو! یہ تو ہوگئیں کچھ کام کی باتیں۔ اب اپنا سبق شروع کرو۔''

ارشد صاحب نے مسکرا کر پڑھانا شروع ہی کیا تھا کہ فیروز اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہا:

''جناب! مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔''

ارشد صاحب نے مسکرا کر کہا: ''ضرور ضرور۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔''

فیروز نے کہا: ''جناب! آپ نے آج جو کچھ کہا ہے میرے دل میں ایک ایک بات اتر گئی ہے۔ آپ نے مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے میرا نام نہیں لیا۔ کل میں نے ہی ارشاد کو برا بھلا کہا تھا۔ میں اپنے بھائی ارشاد سے آپ سب کے سامنے معافی مانگتا ہوں۔ انشاء اللہ اب میری کسی بات سے میرے کسی بھائی کو دکھ نہ پہنچے گا۔''

یہ کہتے ہوئے فیروز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ارشد صاحب نے آگے بڑھ کر فیروز کو گلے سے لگا لیا اور اس سے کہا: ''فیروز! تم بہت بہادر ہو۔۔۔ اپنی غلطی مان لینا سب سے بڑی بہادری ہے۔''

❁❁❁❁

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآن کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہوسکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہوگیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کر دیتے ہیں انہیں تحریکِ طلوع اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لیے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

(پرویزؒ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی ﷺ	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

Is Sexual Relationship a Private Matter?

By G. A. Parwez
(Translated by: Mansoor Alam)

Dr. Unwin further says that:
"Nogroup of human beings, however, has ever been able, or at any rate has ever consented, to tolerate a state of absolute monogamy for very long. This isnot surprising, for it is an unequal bargain for the women; and in the endthey have always been freed from their legal disadvantages. To expressthe matter in popular language, they have been 'emancipated'."[Page 343]

The nation having the top cultural level

According to Dr. Unwin the nation or tribe that had the best culture was the one which insisted on absolute chastity before marriage and practiced modified monogamy after marriage, i.e., after marriage sexual relationship happened only between the married couple but not forced to remain married for life no matter what; that the marriage could be annulled if the husband or wife are not happy living together. This is what the Quran suggests.

The question is: what is the result of putting these restrictions on sexual relationship? Dr. Unwin has presented evidence from different experts and has derived the following conclusion:
"When a desire is compelled to remainunsatisfied, strong mental tension occurs; the emotional energy is compressed." [Page 313]

This compressed energy finds different outlets for its release. This psychological expression is called "sublimation" according to the famous psychoanalyst Dr. Freud. So, Dr. Unwin says:
"Psychologicalresearches reveal that the placing of a compulsory check upon thesexual impulses, that is, a limitation of sexual opportunity, producesthought, reflection, and energy." [Page 317]

Dr. Feud says:
"This secondthesis, which psycho-analysis puts forward as one of its findings, is an assertion that instinctual impulseswhich can only be described as sexual, both in the narrower and wider sense of the word, play anextremely large and never hitherto appreciated part in the causation of nervous and mental diseases. Itasserts further that these

relationship. He describes the kind of society that results from this thus:
In a society which has permitted pre-nuptial sexual freedom for at leastthree generations, any young female can indulge in any sexual play of anykind whatever; she can also have intercourse with any young male. Mutualconsent is the sole consideration. Both the female and the male are free from any restraint; they are not troubled by any of those strong emotionswhich arise in the hearts of those whose adolescent impulses have beenchecked. From earliest childhood they indulge in any sexual play thatattracts them; they notice the contempt which their elders express for theboy or girl who fails to attract the opposite sex; they hear the joking remarkswhich are passed by adult members of the community when a young femalefeels and obeys an urge towards any young male or has any sexual play withhim. They live in an atmosphere of care-free indulgence; and if they feela desire they satisfy it at once.
This is the freedom related sexual emotion that our educated youth want. But what is the result of this? Dr. Unwin puts its thus:
"Sometimes a man has been heard to declarethat he wishes both to enjoy the advantages of high culture and to abolishcompulsory continence. The inherent nature of the human organism,however, seems to be such that these desires are incompatible, even contradictory.The reformer may be likened to the foolish boy who desiresboth to keep his cake and to consume it. Any human society is free to chooseeither to display great energy or to enjoy sexual freedom; the evidence isthat it cannot do both for more than one generation."[Page 412]
Thus to correct this situation he says:
"No society can display productive social energy unless a new generationinherits a social system under which sexual opportunity is reduced to aminimum. If such a system be preserved, a richer and yet richer traditionwill be created, refined by human entropy.There is no need for the whole society to suffer the same continence.So long as the sexual opportunity of one social stratum is maintained at aminimum, the society will display productive energy." [Page 414]
***

The Quranic teaching

Keeping in front the research of Dr. Unwin, let us see what the Quran says on this issue. First of all, please note that the Quran absolutely forbids asceticism and monasticism which teach total abstinence and self-denial and shunning all worldly pleasures. The Quran teaches to benefit from the world and to fulfil instinctual emotions but by being within the limits imposed by it. These limits are imposed by Revelation; therefore, these are eternal and unchangeable. So, these limits are neither

r imposed by society nor any government can change these limits. The Quran calls it protection of chastity when sexual emotions are fulfilled by remaining within these limits.The Quran puts a great emphasis on chastity. The Quran allows only one way to satisfy sexual emotion; and that is Nikah. Therefore, there is absolutely complete continence before Nikah; and after Nikah no extramarital relationship is allowed by the Quran. The Quran imposes severe punishment for fornication. It is better to understand that Nikah is not something temporary arrangement due to mutual agreement. It is a well thought-out agreement between adult boy and adult girl to spend married life amicably by remaining within the limits imposed by the Quran. Therefore, the question for temporary sexual satisfaction, though it may be by mutual agreement, does not arise at all. The Quran has called Nikah as a well though-out solid agreement: مِّيثَاقًا غَلِيظًا (4:21) – most solemn covenant. It is not child play who builds a house and destroys it and builds another house. The Quran declares monogamy as an essential principle; and more than one wife is allowed under strict condition only for solving an emergency social problem. Also, the Quran provides guidelines for divorce. What is called triple Talaq in Sharia is totally against the Quran.

Protecting chastity

When it comes to protecting chastity we normally associate it with females. According to the Quran protection of chastity equally applies to both males and females; that violation leads to criminal punishment equally to both. Wherever the Quran refers to chastity it addresses man first and then the woman. Thisis an important point. If men adhere to chastity in a society then women automatically will bein chastity mode. The Quran describes chastity among the attributes of Momineen: وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ(23:5) – and who are mindful of their chastity. And the Quran declares that: قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ(23:1) – Let Us tell you now about the people whose efforts will bear fruit and attain all-encompassing success, in this world as well as in the hereafter. These are the people who accept the truthfulness of Our Laws; and the implementation of which they make the ultimate aim and mission of their lives.It is clear from this that a nation's success or failure or rise or fall depends on its chastity or lack thereof. This is the reality that Dr. Unwin arrive at after a long period of scholarly research. Look at how he puts it:

“Such, in brief but sufficient outline, were the postnuptialregulations of these vigorous societies; such were their methods ofregulating the relations between the sexes. In each case they reduced theirsexual opportunity to a minimum by the adoption of absolute monogamy;in each case the ensuing compulsory continence produced great social

energy.The group within the society which suffered the greatest continencedisplayed the greatest energy, and dominated the society. When absolutemonogamy was preserved only for a short time, the energy was only expansive,but when the rigorous tradition was inherited by a number of generationsthe energy became productive. As soon as the institution of modifiedmonogamy, that is, marriage and divorce by mutual consent, became partof the inherited tradition of a complete new generation, the energy, eitherof the whole society or of a group within the society, decreased, and thendisappeared." [Page 411-412]

Let me mention that when the Quran has imposed limitations on the satisfaction of instinctual emotions then it is not just for societal advancement but also for individual's self-development and strengthening(and moves on to the life of the hereafter) which requires a separate discussion of its own. Therefore, I am limiting my discussion here to only the issue of societal and national rise and fall.

Self-control

As we have seen the Quran allows only one way to satisfy sexual desires and that is by doing the contract of Nikah.The question is: If this opportunity is not available then what to do? The Quran's answer is: وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيـنَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا (24:33) – And let those who cannot afford to marry, live in continence and practice self-control.People have the wrong concept when they think it is impossible for an adult man or woman to practice self-control. They equate sex as physical need just as hunger and thirst. Well, if one is deeply engrossed in work and is thirsty and does not drink water then after a while the thirst becomes unbearable and he has to drink water. If one does not drink water for few days, then death overtakes. Same things will happen if one does not eat for few more days. So, we see that:

1. Hunger and thirst automatically arise. It does not arise due to an intention or thought.
2. If these are not fulfilled, then these cause sickness and lead to emergency situation and eventually to death. That is why in such situation the Quran allows even haram things to alleviate thirst and hunger.

But sexual need is quite different from these. It never arises unless sexual thought originate into the mind. Please remember that sexual desire never arises without its thought. And if sexual desire is not fulfilled then death does not occur.That is why the Quran does not allow it if Nikah is not possible; and it orders to use self-control (24:33) which is possible to achieve because it is under human's control, not under nature's control as it is in the case of hunger and thirst. As for the common belief that if

sexual desires are not fulfilled then psychological diseases will occur. This isalso wrong. We saw earlier that the research of psychologistswhich shows that practicing self-control and continence not only does not cause any psychological diseases but in fact increases the creative potentialities of individuals and societies. Psychological diseases occur only when one arouses one's sexual drives by creating all kinds of sexual thoughts and finds unnatural ways of their release.

***

Stopping obscenity

So, fanning the flames of sexual desires and obscenities is the cause of many of the societal issues according to the Quran which modern research has now proved it. Protecting chastity requires self-control. But if the environment is full of obscenities then how to achieve self-control and piety. The Quran proposal a solution that cures its root rather than dealing with its numerous symptoms. It says: قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ(7:33) – O Messenger! Say to the people: "My Sustainer has declared to be Haram indecencies in action or in thought and all those things which debilitate human capabilities.Therefore, the Quran has declared that indecencies in action or in thought are forbidden and has suggested severe punishment for those who spread indecency in the societyjust as it has forbidden fornication and instituted severe punishment for it. It says: إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۚ وَاللَّـهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ(24:19) – Take note that those of you who want to spread such scandals within the Momineen, will be severely punished in this world (according to thedivine laws) as well as in the hereafter. Allah knows how seriously it damages societybut you are not cognizant of it. This is like an infection that spreads uncontrolled. But the Momineen always protect themselves from this evil virus: وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ(42:37) – Such people abstain from heinous crimes which weaken the human 'self' as well as from acts which tend to incite universal abomination and selfishness.

From the above it is clear:

1. Sexual desire's flame is lit by thoughts.
2. The Quran calls all the malevolent factors that inflame sexual desire as haram. It calls them by the comprehensive terminology فَوَاحِشَ (or indecency).

Our society and فَوَاحِشَ (or indecency)

It is obvious that in our societyفَوَاحِشَ (or indecency) has spread like a pervasive malevolent virus. The question is: who is responsible for this? Usually the older generation blames the younger one and remains under self-deception by absolvingitself from any accountability for the spread

of this malicious pandemic. This is the way people start blaming others for the spread of any pandemic but don't realize that when it started it could have been controlled by taking proper steps if people at that the helm seriously took steps to stop the spread of any virus. Since they didn't, the spread of the virus became a potent and pervasive pandemic. The Question is: who were originally responsible and when it happened? This topic is so vast that it will require several volumes to describe it. It will suffice at this time to mention that the literature and poetry that started to be written after the fall of Mughal empire was mostly فَوَاحِشَ or indecency-based, and that too of a very immoraland base type. The period of downfall of any nation is very conducive and fertile ground for the spread of indecent, grotesque, and erotic literature.When a nation becomes deprived of real pleasures and ecstasy of positive and creative flow of energy for artistic and literary development during its period of downfall, then it resorts to instant tranquilized and cannibalistic pleasures ofamorous poetry and literature.

Our poetry

I cannot go into the details of this type of base and erotic poetry that was done during just after the fall of Mughal empire. Here is an illustrative example from Dagh Dehlavi:

First I met her, then it arose within
And it stays swingingin cloth within

Our traditional ode and amatory poemsare the most seductive form of so-called literary expression. What are the three characters i.e., the trinity of this kind of poetry? – the lover (the poet), the beloved, and the antagonist, the envious. It is obvious that the beloved cannot be the wife. Therefore, she will be someone's wife or sister or daughter. The beloved is presented as two types – one,free liberal showy type and the other, conservative orthodox type. The lover goes out to romance in the night to the market with his liberal beloved, both enjoy drinking and roaming around freely. But after a while when the lover loses the drive then he tells his beloved (in the words of Ghalib):

If you want to continue then you find someone else
But from time to time keep in touch with me as well

But the otherlover finds it difficult to attract his conservative beloved. But continues his romantic story with her. This is the kind of romance that one poet expressed and pleaded with God not to open file of deeds on the day of judgment:

Because in this file there are names of some veiled beloveds

Leave aside liberal romantic poets, even the conservative and religious and pious poet Hasrat Mohani presents a dramatic way of his beloved story. Here is a portion of this long poem:

I remember my tears flowing in solitude; I still remember the period I had romance with you
With countless impatience and fondness; I remember the first time my heart fell in love with you
Looking with romantic glance again and again; lifting your veil from your eyes I remember you
I became bold after meeting you and then; putting your finger within your teeth I remember you
Sometimes I lifted my window curtain; and you covering your face with scarf I remember you
I dreamed I am kissing your feet in sleep; and you kicked my head with smile I remember you
Hiding and against the wishes of others; coming to my house in the dark night I remember you
In the middle of the hot sunny day to call me; your coming to the roof bare feet I remember you
In order to put henna in hands and feet; my teasing your bare feet and hands I remember you
In spite of Hasrat being pious andreligious; those days of amorous desire, he remembers you

If this is the condition of such a religious and pious person then what to say of so-called progressive liberal poets? In this love-romanticpoetry, the meeting between the lover and the beloved always happens in the night – referred to as the "*nightof meeting*."Here are some examples of this poetry:

God knows the beloved, when will the beloved come;
Should I spread buds or full blown flowers on the bed?

Even a high level poet as Ghalib describes the "spring season has the bed in its lap" and when things move further he says:

My beloved did not appreciate dirty bed;

To Be Continued

مسلم لیگ کے شبانہ جلسوں کے فوراً بعد اسی سٹیج سے بزم اقبال کی محفل آراستہ کی جاتی جس میں پرویز صاحب قرآن کریم اور فکر اقبالؒ کی روشنی میں تحریک پاکستان اور مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کے تصور کو واضح طور پر قوم کے سامنے پیش کرتے۔

یہ عملی جدوجہد قیام پاکستان تک جاری رہی۔ حتیٰ کہ جب 1946ء میں سرخپوشوں اور کانگرس کی ملی بھگت سے مسلم اکثریت کے صوبہ سرحد میں پاکستان میں شمولیت/ عدم شمولیت کے سوال پر ریفرنڈم کرانا طے پایا گیا تو پرویز صاحب صوبہ سرحد میں تشریف لے گئے اور اس وقت کے سرحد مسلم لیگ کے صوبائی صدر خان بخت جمال خان اور ان کے رفقاء کی معاونت سے صوبہ کی کانگرسی وزرات اور سرخپوش لیڈر خان عبدالغفار خان کو ہمہ جہت مخالفتوں کے علی الرغم سرحد کے مسلم عوام کا فیصلہ کن ووٹ پاکستان کے حق میں ڈلوانے میں کامیاب ہوئے۔

علامہ پرویز 38-1937ء سے حضرت قائداعظم علیہ الرحمۃ کے، تحریک پاکستان کی دینی اساس کے موضوع پر ذاتی مشیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ یہی وہ واحد شخصیت تھی جنہیں حضرت قائداعظم سے پیشگی وقت لیے بغیر ان کی خدمت میں، کسی وقت بھی باریابی کا شرف حاصل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ قائداعظمؒ نے قرآنی ہدایات سامنے آجانے کے بعد ہمیشہ انہی کے مطابق عمل کیا پرویز صاحب ان معدودے چند دانشوروں میں شامل ہیں جنہوں نے بقول پیر علی محمد راشدی، پاکستان کی سکیم کی تیاری میں مدد کی تھی۔

حضرت قائداعظمؒ، علامہ پرویز پر غایت اعتماد رکھتے تھے اور ان کی رائے کو اس قدر اہمیت دیتے تھے کہ جب اس کا وقت آیا تو ان سے پاکستان کے سیکرٹریٹ کے لیے مناسب افسروں کے انتخاب کے لیے سفارش طلب کی۔

قیام پاکستان کے بعد اپنی وفات تک جب کسی دریدہ دہن نے بانی پاکستان حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ یا ان کے رفقاء کے خلاف ہرزہ سرائی کی ناپاک کوشش کی تو یہی مرد مجاہد آڑے آیا اور ہر موقع پر ایسے مدلل مقالات سپرد قلم کیے جن سے تحریک پاکستان کے ان زعماء کی عظمت کردار نکھر اور ابھر کر قوم کے سامنے آتی رہی۔

علامہ غلام احمد پرویز نے 24 فروری 1985ء کو وفات پائی۔

❁❁❁❁❁

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.74
ISSUE
05

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web: www.toluislam.org www.facebook.com/talueislam/